مستند اردو کے نمونے

مرتبہ

سر سید راس مسعود بی - اے - آکسن مرحوم

شائع کردہ

نظامی پریس بک ایجنسی بدایوں

سنہ ۱۹۴۳ء

قیمت (عمہ) دو روپیے

پبلشر کی گزارش

مستند اُردو کے نمونے

یہہ کتاب اُردو کے مشہور اور مستند مُصنّفین کے مضامین کے انتخابات کا مجموعہ جس کو ۱۹۱۵ء میں سر سید راس مسعود مرحوم جیسے فاضل ادیب نے قوم کے اُن بچّوں کے لیے جو صحیح اُردو ادب کو سیکھنا چاہتے ہیں تالیف کیا تھا اب ہم اس مجموعہ کو دوبارہ شایع کر رہے ہیں۔ تاکہ مؤلّف کی یادگار اُردو ادب میں تازہ رہے اور موجودہ نسل اس سے فائدہ اُٹھا سکے۔

خاکسار

احمد الدین

نظامی پریس بدایوں
۱۹۴۳ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دُعا

(از آنریبل ڈاکٹر سر سیّد مرحوم)

اے ہمارے مقدس خدا تیرا نام ازل سے مقدس ہی۔ اے قُدّوس مطلق تیرا نام ابد تک مقدّس رہے گا۔ اے ذات پاک تو اپنے آپ ہی مقدّس ہی۔ اگر سارا جہان تیری تقدیس کرے جب بھی تیرے مقدس ہونے میں کچھ زیادتی نہیں۔ اور اگر کوئی بھی تجھ کو مقدّس کہکر نہ پکارے جب بھی تیرے مقدّس ہونے میں کوئی کمی نہیں۔ ہم تیرے عاجز بندے تیرا نام لینے کو مسجدیں بناتے ہیں۔ تیرا نام پاک اُن میں لیتے ہیں۔ اُس کے محرابوں میں کھڑے ہوکر تجھ مقدس کو مقدس کہکر پکارتے ہیں۔ وہ عمارتیں کچھ ہمارے گھر نہیں ہیں۔ اور نہ تو کسی کا محتاج ہے۔ مگر خاص تیرا نام لینے سے وہ عمارتیں تیرا گھر کہلاتی ہیں۔ ہم خود جانتے ہیں کہ وہ اینٹ پتّھر جو اُن عمارتوں میں لگتا ہی کچھ مقدس نہیں ہے اور عمارتوں کی خوبصورتی اور عالی شانی کچھ مقدس نہیں ہی بلکہ تیرا نام مقدس ہے تیرے نام سے تیرا گھر مقدس گنا جاتا ہے۔ پھر جیسے کہ تو تمام جہان کا مالک ہی اپنے اُس گھر کا بھی مالک ہی۔ خواہ تو اُس کو آباد رکھ خواہ تو اُس کو ویران رکھ۔ اور تیرا نام ویسا ہی مقدس ہی جیسا کہ ازل سے ہے اور ابد تک

رہے گا۔

اے خدا اکبر آباد کی یہ جامع مسجد تیرا مقدس نام لینے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اُس کے پتھر جن سے یہ بنی ہی کچھ مقدس ہونے کے لایق نہ تھے۔ مگر تیرے مقدس نام نے جو اُس میں لیا جاتا تھا اُس کو مقدس ٹھیرایا تھا۔ ہم تیرے گنہگار بندے جو سر سے پاؤں تک گناہوں کی نجاست میں آلودہ ہیں تیرا مقدس نام لینے کے لایق نہیں ہیں۔ تیرا فضل اور تیرا احسان ہی جو ہماری ناپاک زبان سے اپنا مقدس نام لیواتا ہے۔ یہ بات بہت ظاہر ہی کہ اینٹ اور پتھر جس سے تیرا مقدس نام لینے کو تیرا گھر بنایا گیا ہی کسی گنہ سے گنہگار ہونے کے لایق نہ تھا۔ ہماری شامت اعمال اور ہمارے دل کی برائیوں کی سرایت نے ہم کو ایسا ناپاک کر دیا تھا کہ خود ہمارے جسم اس لایق نہ رہے تھے کہ تیرے مقدس نام کے گھر میں بھی داخل ہوں۔ اے خدا تو نے ہمارے گناہوں پر نظر نہیں کی۔ اے خدا تو نے اپنی رحمت ہم گنہگار بندوں پر کی۔ اے مقدس تو نے ہمارے ناپاک جسموں کو اپنے رحم سے قبول کیا۔ اے خدا تو نے اپنے فضل سے ہمارے حاکموں کے دل میں ڈالا کہ پھر تیرے اس گھر میں تیرا نام لیں۔ تیرے نام کی ستایش کریں۔ تجھ قدوس کو مقدس کہکر پکاریں۔ پس ہم تیرے بندے تیرا شکر بجالاتے ہیں۔ اور اُن حاکموں کو جنھوں نے تیرے مقدس نام کا ادب کیا۔ دل سے دعاء خیر دیتے۔ اے پاک پروردگار تو ہمارے اس

ناچیز شکر کو اور ہماری اس دعا کو اپنے فضل سے قبول کر۔ اور جیسے کہ تو مقدس ہی ہمارے بدن اور ہمارے دل اور ہماری جان اور ہماری روح کو اپنے لیے مقدس کر اور گناہوں سے بچا۔ اور اپنی خاص مرضی پر چلا۔ اور اپنے گھر کو اپنے مقدس نام سے آباد رکھ۔ آمین

گزرا ہُوا زمانہ

(از آنریبل ڈاکٹر سرسیّد مرحوم)

برس کی اخیر رات کو ایک بُڈّھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہی۔ رات بھی ڈراونی اور اندھیری ہی۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے۔ آندھی بڑے زور سے چلتی ہے۔ دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بُڈّھا نہایت غمگین ہے۔ مگر اُس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہی نہ اکیلے پن پر اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر اور نہ برس کی اخیر رات پر۔ وہ اپنے پچھلے زمانے کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے اُتنا ہی غم بڑھتا ہے۔ ہاتوں سے ڈھکے ہوئے مُنہ پر آنکھوں سے آنسو بھی بہے چلے جاتے ہیں۔

پچھلا زمانہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اپنا لڑکپن اُس کو

یاد آتا ہے۔ جبکہ اُس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ رُوپیہ اشرفی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر ماں باپ۔ بھائی بہن اُس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لیے چھُٹّی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لے مکتب میں چلا جاتا تھا مکتب کا خیال آتے ہی اُس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا۔ اور بے اختیار چلّا اُٹھتا تھا۔ "ہائے وقت ہائے گزرے ہوئے زمانے۔ افسوس کہ میں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا۔"

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سُرخ سفید چہرہ۔ سڈول۔ ڈیل بھرا بھرا بدن۔ رسیلی آنکھیں۔ موتی کی لڑی سے دانت۔ اُمنگ میں بھرا ہوا دل۔ جذبات انسانی کے جوشوں کی خوشی اُسے یاد آتی تھی۔ اُس آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانے میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی اور خداپرستی کی بات بتاتے تھے۔ اور یہ کہتا تھا کہ "اُوہ ابھی بہت وقت ہے" اور بڑھاپے آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ اُس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا۔ کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور خداپرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا۔ اور موت کے لیے تیار رہتا۔ آہ وقت گذر گیا۔ آہ وقت گذر گیا۔ اب پچتائے کیا ہوتا ہے۔ افسوس میں نے آپ اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہکر برباد کیا کہ "ابھی وقت

بہت ہی۔"

یہ کہکر وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی۔ دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراؤنی ہی۔ اندھیری گھٹا چھا رہی ہی۔ بجلی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے۔ ہولناک آندھی چل رہی ہی۔ درختوں کے پتّے اُڑتے ہیں اور ٹہنے ٹوٹتے ہیں۔ تب وہ چلّاکر بولا "ہائے ہائے میری گزری ہوئی زندگی بھی ایسی ہی ڈراؤنی ہی جیسی یہ رات۔ یہ کہکر پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اُس کو اپنے ماں باپ بھائی بہن۔ دوست و آشنا یاد آئے۔ جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبّت سے اُس کو چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہی یہ کہتی ہوئی کہ ہائے بیٹا وقت گزر گیا۔ باپ کا نورانی چہرہ اُس کے سامنے ہے اور اُس میں یہ آواز آتی ہے۔ کہ کیوں بیٹا ہم تمھارے ہی بھلے کے لیے نہ کہتے تھے۔ بھائی بہن دانتوں میں اُنگلی دیے ہوے خاموش ہیں۔ اور اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہی۔ دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اب ہم کیا کرسکتے ہیں۔

ایسی حالت میں اُس کو اپنی وہ باتیں یاد آتی تھیں جو اُس نے نہایت بے پروائی اور بے مروّتی اور کج خلقی سے اپنے ماں باپ۔ بھائی

بہن۔ دوست آشنا۔ کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا۔ باپ کو ناراض کرنا۔ بھائی بہن سے بے مروّت رہنا۔ دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا۔ اور اُس پر اُن گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبّت کا دیکھنا اُس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اُس کا دم چھاتی میں گھُٹ جاتا تھا اور یہ کہکر چلّا اُٹھتا تھا کہ "ہائے وقت نکل گیا ہائے وقت نکل گیا۔ اب کیوں کر اس کا بدلہ ہوگا"

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اور ٹکراتا لڑکھڑاتا کھڑکی تک پہنچا۔ اور اس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے۔ اور بجلی کی چمک کچھ تھمی ہی۔ پر رات ویسی ہی اندھیری ہی۔ اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنا ادھیڑ پنا یاد آیا جس میں نہ وہ جوانی کا جوبن نہ وہ دل رہا تھا اور نہ دل کے ولولوں کا جوش۔ اُس نے اپنی اُس نیکی کے زمانے کو یاد کیا جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا وہ اپنا روزہ رکھنا۔ نمازیں پڑھنی۔ حج کرنا۔ زکوٰۃ دینی۔ بھوکوں کو کھلانا۔ مسجدیں اور کنوئیں بنوانا یاد کر کر اپنے دل کو تسلّی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی اپنے پیروں کو جن سے بیعت کی تھی اپنی مدد کو پکارتا تھا۔ مگر دل کی بیقراری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اُس کے ذاتی اعمال کا اُسی تک خاتمہ ہی۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں۔ مسجدیں ٹوٹ کر یا تو

کھنڈر ہیں اور پھر ویسے ہی جنگل ہیں۔ کنوئیں اندھے پڑے ہیں۔ نہ پیر اور نہ فقیر۔ کوئی اُس کی آواز نہیں سنتا اور نہ مدد کرتا ہے۔ اُس کا دل پھر گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا۔ یہ پچھلی سمجھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی اب کچھ بس نہیں چلتا۔ اور پھر یہ کہکر چلّا اُٹھا "ہائے وقت ہائے وقت۔ میں نے تجھ کو کیوں کھودیا"

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اُس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے۔ آندھی تھم گئی ہے۔ گھٹا کھل گئی ہے۔ تارے نکل آئے ہیں۔ اُن کی چمک سے اندھیرا ابھی کچھ کم ہوگیا ہے وہ دل بہلانے کے لیے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا کہ یکایک اُس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوبصورت دُلہن نظر آئی۔ اُس نے ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اُسے دیکھتا تھا وہ قریب ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اُس کے بہت پاس آگئی۔ وہ اُس کے حسن و جمال کو دیکھکر حیران ہوگیا۔ اور نہایت پاک دل اور محبّت کے لہجہ سے اُس سے پوچھا کہ تم کون ہو۔ وہ بولی کہ میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔ اُس نے پوچھا کہ تمھارے تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے۔ وہ بولی ہاں ہے۔ نہایت آسان پر بہت مشکل۔ جو کوئی خدا کے فرض اُس بدوی کی طرح جس نے کہا کہ "واللہ لا ازید ولا انقص" (ترجمہ۔ قسم خدا کی نہ بڑھاؤں گا نہ گھٹاؤں گا)

ادا کر انسان کی بھلائی اور اُس کی بہتری میں سعی کرے اس کی میں مسخّر ہوی۔ دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ انسان ہی ایسی چیز ہی جو اخیر تک رہے گا۔ پس جو بھلائی انسان کی بہتری کے لیے کی جاتی ہی وہی نسل درنسل اخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ اُسی تک ختم ہو جاتا ہے۔ اُس کی موت اُن سب چیزوں کو ختم کر دیتی ہی۔ مادّی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں۔ مگر انسان کی بھلائی اخیر تک جاری رہتی ہی۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں۔ جو مجھکو تسخیر کرنا چاہے انسان کی بھلائی میں کوشش کرے۔ کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں دل وجان ومال سے ساعی ہو۔ یہ کہکر وہ دُلہن غائب ہوگئی اور بُڈھا پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اب پھر اُس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اُس نے اپنے پچپن ۵۵ برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی اور کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی کا نہیں کیا تھا۔ اُس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے۔ نیک کام جو کیے تھے ثواب کے لالچ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کیے تھے۔ خاص قومی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچکر وہ اُس دلفریب دُلہن کے ملنے سے مایوس ہوا۔ اپنا اخیر زمانہ دیکھ کر آیندہ کرنے کی بھی کچھ امید نہ پائی۔ تب تو نہایت مایوسی کی حالت میں بیقرار ہوکر چلّا اُٹھا ہائے ہائے وقت۔ کیا میں پھر

مجھے بلا سکتا ہوں۔ ہائے میں دس ہزار دینار یں دیتا اگر وقت پھر آتا اور میں جوان ہو سکتا۔ یہ کہکر اُس نے ایک آہ سرد بھری اور بے ہوش ہو گیا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اُس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔ اُسکی پیاری ماں اُس کے پاس آکھڑی ہوئی۔ اُس کو گلے لگا کر اُس کی بچّی لی۔ اُس کا باپ اُس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اُس کے گرد آکھڑے ہوئے۔ ماں نے کہا کہ بیٹا کیوں برس کے برس دن روتا ہی۔ کیوں تو بیقرار ہے کس لیے تیری ہچکی بندھ گئی ہی۔ اُٹھ منہ ہاتھ دھو کپڑے پہن۔ نوروز کی خوشی منا۔ تیرے بھائی بہن منتظر کھڑے ہیں۔ تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بُڈھا ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا۔ اُس نے سُنکر اُس کو جواب دیا کہ بیٹا بس تو ایسا مت کر جیسا اُس پشیمان بُڈھے نے کیا۔ بلکہ ایسا کر جیسا تیری دُلہن نے تجھ سے کہا۔

یہ سُنکر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا اور نہایت خوشی سے پکارا کہ "اوہی! میری زندگی کا پہلا دن ہی۔ میں کبھی اُس بُڈھے کی طرح نہ پچتاؤں گا اور ضرور اُس دُلہن کو بیاہوں گا جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھکو دکھلایا اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلایا۔ اوخدا او خدا تو میری مدد کر۔ آمین۔

پس اے میرے نوجوان ہموطنوں - اور اے میری قوم کے بچو۔ اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو تا کہ اخیر وقت میں اُس بڈھے کی طرح نہ پچتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اُٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے - آمین

(تہذیب الاخلاق)

بحث و تکرار

(از آنریبل ڈاکٹر سر سیّد مرحوم)

جب کتّے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بُری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز اِن کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے - پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھلائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے - پھر باچھیں چِر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور غیف آواز کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔

اس کا ہاتھ اُس کے گلے میں اور اُس کی ٹانگ اُس کی کمر میں۔ اُس کا کان اُس کے منہ میں اور اس کا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں۔ اس نے اُس کو کاٹا اور اُس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبھوڑا جو کمزور رہا دُم دبا کر بھاگ نِکلا۔

نامہذّب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح پر تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مِل بیٹھتے ہیں۔ پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے واہ تم کیا جانو وہ بولتا ہے تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے۔ تیوری چڑھ جاتی ہے۔ رُخ بدل جاتا ہے۔ آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں۔ باچھیں چِر جاتی ہیں۔ دانت نکل پڑتے ہیں۔ تھوک اُڑنے لگتا ہے۔ باچھوں تک کف بھر آتے ہیں۔ سانس جلدی چلنی ہے۔ رگیں تن جاتی ہیں۔ آنکھ۔ ناک۔ بھوں۔ ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ عیف عیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستین چڑھا ہاتھ پھیلا۔ اُس کی گردن اُس کے ہاتھ میں اور اُس کی داڑھی اُس کی مٹھی میں لپاڈُکی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھُڑا دیا تو غُرّاتے ہوئے ایک اِدھر چلا گیا اور ایک اُدھر۔ اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے

اپنی راہ لی۔

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اُسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرفش ہو کر رہ جاتی ہے۔ کہیں توں تکار تک نوبت آجاتی ہے۔ کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گزر جاتی ہے۔ مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کُتّوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کُتّوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔

انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اُس کے پرکھنے کے لیے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے۔ اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے۔ مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب و شایستگی محبّت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہ چاہیے۔

پس اے میرے عزیز ہموطنوں۔ جب تم کسی کے برخلاف کوئی بات کہنی چاہو یا کسی کی بات کی تردید کا ارادہ کرو تو خوش اخلاقی اور تہذیب کو ہاتھ سے مت دو۔ اگر ایک ہی مجلس میں دُو بدُو بات چیت کرتے ہو تو اور بھی نرمی اختیار کرو۔ چہرہ۔ لہجہ۔ آواز۔ وضع۔ لفظ اس طرح رکھو جس سے تہذیب اور شرافت ظاہر ہو۔ مگر بناوٹ بھی نہ پائی جاوے۔

تردیدی گفتگو کے ساتھ ہمیشہ سادگی سے معذرت کے الفاظ استعمال کرو۔ مثلاً یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آیا یا شاید مجھے دھوکہ ہوا۔ یا میں غلط سمجھا گو بات تو عجیب ہے مگر آپ کے فرمانے سے باور کرتا ہوں۔ جب دو تین دفعہ بات کا اُلٹ پھیر ہوا اور کوئی اپنی رائے کو نہ بدلے تو زیادہ تکرار مت بڑھاؤ۔ یہ کہکر کہ میں اس بات کو پھر سوچوں گا یا اُس پر پھر غور کروں گا۔ جھگڑے کو ہنسی خوشی دوستی کی باتیں کہکر ختم کرو۔ دوستی کی باتوں میں اپنے دوست کو یقین دلاؤ کہ اُس دو تین دفعہ کے اُلٹ پھیر سے تمھارے دل میں کچھ کدورت نہیں آئی ہے اور نہ تمھارا مطلب باتوں کے اُس اُلٹ پھیر سے اپنے دوست کو کچھ تکلیف دینے کا تھا کیونکہ جھگڑا ایسا شبہ زیادہ دنوں تک رہنے سے دونوں کی محبّت میں کمی ہو جاتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ دوستی ٹوٹ جاتی ہے اور ایسی عزیز چیز (جیسے کہ دوستی) ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔

جبکہ تم مجلس میں ہو جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہیں تو جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثہ کو آنے مت دو کیونکہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے جب دیکھو کہ تقریر لپٹی ہوئی جاتی ہے اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگی ہے تو

جس قدر جلد ممکن ہو اُس کو ختم کرو۔ اور آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ہموطن اس بات پر غور کریں کہ اُن کی مجلسوں میں آپس کے مباحثہ اور تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے۔

خوشامد

(از آنربیل ڈاکٹر سید مرحوم)

دل کی جس قدر بیماریاں ہیں اُن میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے۔ جس وقت کہ انسان کے بدن میں ایسا مادّہ پیدا ہوجاتا ہے جو وبائی ہوا کے اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے تو اُسی وقت انسان مرض مہلک میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جبکہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اُس کے دل میں ایک ایسا مادّہ پیدا ہوجاتا ہے جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے۔ جس طرح کہ خوش گلو گانے والے کا راگ اور خوش آیند باجے کی آواز انسان کے دل کو نرم کر دیتی ہے۔ اسی طرح خوشامد بھی انسان کے دل کو پگھلا دیتی ہے کہ ہر ایک کانٹے کے چبھنے کی جگہ اُس میں ہو جاتی ہے۔

اول اول یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی آپ خوشامد کرتے ہیں اور اپنی

ہر ایک چیز کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اور آپ ہی آپ اپنی خوشامد کر کر اپنے دل کو خوش کرتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اوروں کی خوشامد ہم میں اثر کرنے لگتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول تو خود ہم کو اپنی محبت پیدا ہوتی ہے۔ پھر یہی محبت ہم سے باغی ہو جاتی ہے۔ اور ہمارے بیرونی دشمنوں سے جا ملتی ہے۔ اور جو محبت و مہربانی ہم خود اپنے ساتھ کرتے تھے وہ ہم خوشامدیوں کے ساتھ کرنے لگتے ہیں۔ اور وہی ہماری محبت ہم کو یہ بتلاتی ہے کہ اُن خوشامدیوں پر مہربانی کرنا نہایت حق اور انصاف ہے۔ جو ہماری باتوں کو ایسا سمجھتے ہیں اور اُن کی اس قدر قدر کرتے ہیں جبکہ ہمارا دل ایسا نرم ہو جاتا ہے اور اس قسم کے پھسلاوے اور فریب میں آجاتا ہے تو ہماری عقل خوشامدیوں کے مکر و فریب سے اندھی ہو جاتی ہے۔ اور وہ مکر و فریب ہماری بیمار طبیعت پر غالب آجاتا ہے۔

لیکن اگر ہر شخص کو یہ بات معلوم ہو جاوے کہ خوشامد کا شوق کیسے نالایق اور کمینہ سببوں سے پیدا ہوتا ہے تو یقینی خوشامد کی خواہش کرنے والا شخص بھی ویسا ہی نالایق اور کمینہ متصور ہونے لگے گا۔ جبکہ ہم کو کسی ایسے وصف کا شوق پیدا ہوتا ہے جو ہم میں نہیں ہے یا ہم ایسے بننا چاہتے ہیں جیسے کہ درحقیقت ہم نہیں ہیں۔ تب ہم اپنے تئیں خوشامدیوں کے حوالے کرتے ہیں جو اوروں کے اوصاف اُن اوروں کی

خوبیاں ہم میں لگانے لگتے ہیں۔ گو بسبب اُس کمینہ شوق کے اُن خوشامدی
کی باتیں ہم کو اچھی لگتی ہوں۔ مگر درحقیقت وہ ہم کو ایسے ہی بدزیب
ہیں جیسے کہ دوسروں کے کپڑے جو ہمارے بدن پر کسی طرح ٹھیک نہیں۔
اس بات سے کہ ہم اپنی حقیقت کو چھوڑ کر دوسرے کے اوصاف اپنے
میں سمجھنے لگیں۔ یہ بات نہایت عمدہ ہے کہ ہم خود اپنی حقیقت کو درست
کریں اور سچ مچ وہ اوصاف خود اپنے میں پیدا کریں اور بعوض جھوٹی نقل
بننے کے خود ایک اچھی اصل ہو جاویں۔ کیونکہ ہر قسم کی طبیعتیں جو انسان
رکھتے ہیں اپنے اپنے موقع پر مفید ہو سکتی ہیں۔ ایک تیز مزاج اور
چست چالاک آدمی اپنے موقع پر ایسا ہی مفید ہوتا ہے۔ جیسے کہ ایک
رونی صورت کا چپ چاپ آدمی اپنے موقع پر۔

خودی جو انسان کو برباد کرنے والی چیز ہے جب چپ چاپ
سوئی ہوئی ہوتی ہے تو خوشامد اُس کو جگاتی اور اُبھارتی ہے۔ اُس میں
چھچھورے پن کی کافی لیاقت پیدا کر دیتی ہے۔ مگر یہ بات بخوبی یاد رکھنی
چاہیے کہ جس طرح خوشامد ایک بدتر چیز ہے اسی طرح مناسب اور سچی
تعریف کرنا نہایت عمدہ اور بہت ہی خوب چیز ہے۔ جس طرح کہ لائق شاعر
دوسروں کی تعریف کرتے ہیں کہ اُن اشعار سے اُن لوگوں کا نام باقی
رہتا ہے دونوں شخص خوش ہوتے ہیں۔ ایک اپنی لیاقت کی وجہ سے

اور دوسرا اُس لیاقت کو تمیز کرنے کے سبب سے۔ مگر لیاقت شاعری کی یہ ہی کہ وہ نہایت بڑے اُستا د مصوّر کے مانند ہو کہ اصل صورت اور رنگ اور خال خط کو بھی قایم رکھتا ہے۔ اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہی کہ خوش نما معلوم ہو۔

ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہی کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں اُس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں جن کے سبب سے وہ تعریف تعریف نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں۔

ناموری کی مثال نہایت عمدہ خوشبو کی ہی۔ جب ہوشیاری اور سچّائی سے ہماری واجب تعریف ہوتی ہے تو اُس کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے عمدہ خوشبو کا مگر جب کسی کمزور دماغ میں زبردستی سے وہ خوشبو ٹھونس دی جاتی ہے تو ایک تیز بو کی مانند دماغ کو پریشان کر دیتی ہے۔ فیاض آدمی کو بدنامی اور نیک نامی کا زیادہ خیال ہوتا ہے اور عالی ہمّت طبیعت کو مناسب عزت اور تعریف سے ایسی ہی تقویت ہوتی ہے جیسے کہ غفلت اور حقارت سے پست ہمّتی ہوتی ہے۔ جو لوگ کہ عوام کے درجہ سے اوپر ہیں اُنھیں لوگوں پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہی جیسے کہ تھرما میٹر میں وہی حصہ موسم کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے جو صاف

اور سب سے اوپر ہوتا ہے۔ (تہذیب الاخلاق)

تعصّب

(از ڈاکٹر سر سیّد مرحوم)

انسان کی بدترین خصلتوں میں سے تعصّب بھی اک بدترین خصلت ہے۔ یہ ایسی بدخصلت ہے کہ انسان کی تمام نیکیوں اور اُس کی تمام خوبیوں کو غارت اور برباد کرتی ہے۔ متعصّب گو اپنی زبان سے نہ کہے۔ مگر اُس کا طریقہ یہ بات جتلاتا ہے کہ عدل و انصاف کی خصلت جو عمدہ ترین خصائل انسانی سے ہے اُس میں نہیں ہے۔ متعصّب اگر کسی غلطی میں پڑتا ہے تو اپنے تعصب کے سبب اُس غلطی سے نکل نہیں سکتا۔ کیونکہ اُس کا تعصّب اس کے برخلاف بات کے سننے اور سمجھنے اور اُس پر غور کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور اگر وہ کسی غلطی میں نہیں ہے بلکہ سچّی اور سیدھی راہ پر ہے تو اُس کے فائدے اور نیکی کو پھیلنے اور عام ہونے نہیں دیتا۔ کیونکہ اُس کے مخالفوں کو اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کا موقعہ نہیں ملتا۔

تعصّب انسان کو ہزار طرح کی نیکیوں کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے اکثر دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کو نہایت عمدہ

اور مفید سمجھتا ہے مگر صرف تعصّب سے اُس کو اختیار نہیں کرتا - اور دیدہ ودانستہ بُرائی میں گرفتار اور بھلائی سے بیزار رہتا ہے -

مذہبی تعصّبات کی نسبت بھی ہم کچھ تھوڑا سا بیان کریں گے . مگر اول امور تمدّن و معاشرت میں جو نقصان تعصّب سے پیدا ہوتے ہیں اُن کا ذکر کرتے ہیں -

انسان قواعد قدرت کے مطابق مدنی الطّبع پیدا ہوا ہے - وہ تنہا اپنی حوائج ضروری کو مہیّا نہیں کر سکتا - اس کو ہمیشہ مددگاروں اور معاونوں کی جو دوستی اور محبّت سے ہاتھ آتے ہیں ضرورت ہوتی ہے - مگر متعصّب بسبب اپنے تعصّب کے تمام لوگوں سے منحرف اور بیزار رہتا ہے - اور کسی کی دوستی اور محبت کی طرف بجز اُن چند لوگوں کے جو اُس کے ہم راے ہیں مائل نہیں ہوتا -

عقل اور قواعد قدرت کا مقتضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ امور متعلّق تمدن و معاشرت میں جو باتیں زیادہ آرام اور زیادہ لیاقت اور زیادہ عزت کی ہیں اُن کو انسان اختیار کرے مگر متعصّب اُن سب نعمتوں سے محروم رہتا ہے -

ہنر اور فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ ان میں سے ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا چاہیے - مگر متعصّب اپنی بد خصلت

سے ہر ایک ہنر اور فن اور علم کے اعلیٰ درجہ تک پہنچنے سے محروم رہتا ہی۔

وہ اُن تمام دلچسپ اور مفید باتوں سے جو نئی تحقیقات سے اور نئے علوم اور فنون سے حاصل ہوتی ہیں محض جاہل اور ناواقف رہتا ہی اُس کی عقل اور اُس کے دماغ کی قوّت محض بیکار ہو جاتی ہے۔ اور جو کچھ اُس میں سمائی ہوئی ہی اُس کے سوا اور کسی بات کے سمجھنے کی اُس میں طاقت اور قوّت نہیں رہتی وہ ایک ایسے جانور کے مانند ہو جاتا ہے کہ اُس کو جو کچھ بالطبع آتا ہے اُس کے سوا اور کسی چیز کی تعلیم و تربیت کے قابل نہیں ہوتا۔

بہت سی قومیں ہیں جو اپنے تعصّب کے باعث سے تمام باتوں میں کیا اخلاق میں اور کیا علم و ہنر میں اور کیا فضل و دانش میں اور کیا تہذیب و شایستگی میں اور کیا جاہ و حشمت اور مال و دولت میں اعلیٰ درجہ سے نہایت پست درجۂ مذلت اور خواری کو پہنچ گئی ہیں۔ اور بہت سی قومیں ہیں جنھوں نے اپنی بے تعصبی سے ہر جگہ اور ہر قوم سے اچھی اچھی باتیں اخذ کیں اور ادنےٰ درجہ سے ترقی کے اعلےٰ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئیں۔

مجھ کو اپنے ملک کے بھائیوں پر اس بات کی بدگمانی ہے کہ وہ بھی تعصّب کی بدخصلت میں گرفتار ہیں اور اس سبب سے ہزاروں

قسم کی بھلائیوں کے حاصل کرنے سے اور دنیا میں اپنے تئیں ایک معزز قوم کو دکھانے سے محروم اور ذلّت اور خواری اور بے علمی اور بے ہنری کی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ اور اسی لیے میری خواہش ہے کہ وہ اس بدخصلت سے نکلیں اور علم و فضل اور ہنر و کمال کے اعلےٰ درجہ کی عزت تک پہنچیں۔

ہم مسلمانوں میں ایک غلطی یہ پڑی ہے کہ بعضی دفعہ ایک غلط نمائیکی کے جذبہ سے تعصّب کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اور جو شخص اپنے مذہب میں بڑا متعصب ہو اور تمام شخصوں کو جو اُس کے مذہب کے نہیں ہیں۔ اور تمام اُن علوم و فنون کو جو اُس مذہب کے لوگوں میں نہیں ہیں نہایت حقارت سے دیکھے اور بُرا سمجھے۔ اُس شخص کو نہایت قابل تعریف اور توصیف کے اور بڑا پختہ اور پکّا اپنے مذہب میں سمجھتے ہیں۔ مگر ایسا سمجھنا سب سے بڑی غلطی ہی۔ جس نے حقیقت میں مسلمانوں کو برباد کر دیا ہی۔

ہمارا مذہب اور مذہبی علوم اور دنیا اور دنیاوی علوم بالکل علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ پس بڑی نادانی ہی جو دنیاوی علوم اور فنون کے سیکھنے میں کسی قسم کے تعصّب مذہبی کو کام میں لاویں۔

اگر یہ خیال ہو کہ اُن دنیاوی علوم کے سیکھنے سے ہمارے عقائد مذہبی میں سستی آتی ہے کیونکہ مذہبی مسائل اُن دنیاوی علوم کے پڑھنے سے

مشتبہ یا غلط معلوم ہوتے ہیں تو نہایت ہی افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان اپنے ایسے روشن اور مستحکم سچے مذہب کو ایسا ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں کہ دنیاوی علوم کی ترقی سے اُس کی برہمی کا خیال کرتے ہیں۔ نعوذ باللہ منہا۔ مذہب اسلام ایسا مستحکم اور سچا مذہب ہے کہ جس قدر دینی اور دنیاوی علوم کی ترقی ہوتی جاوے گی۔ اُسی قدر اُس کی سچائی زیادہ تر ثابت ہوگی۔

اب ہم یہ بات بتاتے ہیں کہ اپنے مذہب میں پختہ ہونا جُدا بات ہے اور یہ ایک نہایت عمدہ صفت ہے جو کسی اہلِ مذہب کے لیے ہوسکتی ہے اور تعصّب گو کہ وہ مذہبی باتوں میں کیوں نہو نہایت بُرا اور خود مذہب کو نقصان پہنچانے والا ہے۔

غیر متعصب مگر اپنے مذہب میں پختہ ہمیشہ سچا دانا دوست اپنے مذہب کا ہوتا ہے۔ اُس کی خوبیوں اور نیکیوں کو پھیلاتا ہے۔ اُس کے اصولوں کو دلائل و براہین سے ثابت کرتا ہے۔ مخالفوں اور معترضوں اور بُرا کہنے والوں کی باتوں کو ٹھنڈے دل سے سُنتا ہے اور خود بھی اُس کے دفعیہ پر مستعد ہوتا ہے اور اور لوگوں کو بھی اُس کے دفعیہ کا موقع دیتا ہے۔

برخلاف اس کے متعصب نادان دوست اپنے مذہب کا

ہوتا ہی۔ وہ سراسر اپنی نادانی سے اپنے مذہب کو نقصان پہنچاتا ہی۔
پہلی بسم اللہ ایسی بدخصلت اختیار کرنے سے جو ہر عقلمند کے نزدیک
نفرت کے قابل ہی۔ اپنے مذہب کے حسن اخلاق اور اُس کے نتیجوں
کی خوبی پر داغ لگاتا ہے۔ اپنے مذہب کی خوبیوں کے پھیلنے اور لوگوں
کو اُس کے طرف راغب کرنے کے بدلے اُلٹا اُس کا حارج قوی ہوتا ہی۔
اپنے تعصّب کے سبب بداخلاق اور مغرور اور منقشف سخت دل ہوجاتا
ہے اور ٹھیک ٹھیک اس آیت کریمہ لو کُنتَ فظًّا غلیظَ القلب
لانفضوّ من حولکَ سے مخالفت صریح کرتا ہی۔

مذہبی متعصّب شخص دوسروں کے اعتراضوں کو جو اس کے
مذہب پر ہیں سننا یا مشہور ہونا پسند نہیں کرتا۔ اور اس سبب سے ضمناً
وہ اس بات کا باعث ہوتا ہے کہ مخالفوں کے اعتراض بلا تحقیقات کے
اور بلا جواب دیے باقی رہ جاویں۔ وہ اپنی نادانی سے تمام دنیا پر گویا
یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ اس کے مذہب کو مخالفوں کے اعتراضوں سے
نہایت اندیشہ اور اس کے برہم ہوجانے کا خوف ہی۔ پس یہ تمام
باتیں مذہب کی دوستی کی نہیں ہیں۔ بلکہ مخالفوں کی فتح یابی اور میدان
جیت لینے کی ہیں۔

غرضکہ تعصّب خواہ دینی باتوں میں ہو یا دنیاوی باتوں میں۔

نہایت بُرا اور بہت سی خرابیوں کا پیدا کرنے والا ہی۔

مغرور و متکبّر ہوجانا اور اپنے ہم جنسوں کو سوائے چند کے نہایت حقیر و ذلیل سمجھنا متعصب کا خاصّہ ہوتا ہے۔

اُس کے اصولوں کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ تمام دنیا کے لوگوں سے سوائے چند کے کنارہ گزین ہو مگر ایسا کر نہیں سکتا۔ اور بمجبوری ہر ایک سے ملتا ہے اور اوپرے دل سے اُن کا ادب اور اپنی جھوٹی نیازمندی بھی ظاہر کرتا ہے۔ اور ایسا کرنے سے ایک بدخصلت نفاق اور کذب اور دغابازی اور فریب و مکّاری کی اپنے میں پیدا کرتا ہی۔

دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے خود ہی تمام کمالات اور تمام خوبیاں اور خوشیاں حاصل کی ہوں۔ بلکہ ہمیشہ ایک قوم نے دوسری قوم سے فائدہ اُٹھایا ہی مگر متعصب شخص ان نعمتوں سے بدنصیب رہتا ہے۔

علم میں اُس کو ترقّی نہیں ہوتی۔ ہنر و فن میں اُس کو دستگاہ نہیں ہوتی۔ دنیا کے حالات سے وہ ناواقف رہتا ہے۔ عجائبات قدرت کے دیکھنے سے محروم ہوتا ہے۔ حصول معاش اور دنیاوی عزت اور تمدّن مثل تجارت وغیرہ کے وسیلے جاتے رہتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ تمام دنیا کے انسانوں میں روز بروز ذلیل و خوار اور حقیر و ناچیز ہوتا جاتا ہی۔

اُس کی مثال ایک ایسے جانور کی ہوتی ہے جو اپنے بلٹ میں ملا رہتا ہے اور نہیں جانتا کہ اُس کے اور ہم جنس کیا کرتے ہیں۔ بلبل کیا چہچہاتی ہے اور قمری کیا غل مچاتی ہے۔ بیا کیا بن رہا ہے اور کلی کیا چن رہی ہے۔

وہ بجز کوڑے پر کی گھاس کے چرنے کے اور کچھ نہیں جانتا کہ باغ کیوں بنا ہے اور پھول کیوں کھلا ہے۔ نرگس کیا دیکھتی ہے۔ اور انگور کی تاک کیا تاکتی ہے۔

تعصب میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ جب تک وہ نہیں جاتا کوئی ہنر و کمال اُس میں نہیں آتا۔ تربیت اور شائستگی۔ تہذیب و انسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا۔ اور جبکہ وہ مذہبی غلط نمائی کے پردے میں ظہور کرتا ہے تو اور بھی سم قاتل ہوتا ہے۔ کیونکہ مذہب سے اور تعصب سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ انسان کی خراب و برباد کرنے کے لیے شیطان کا سب سے بڑا داؤں تعصب کو مذہبی رنگت سے دل میں ڈالنا اور اس تاریکی کے فرشتہ کو روشنی کا فرشتہ کرکر دکھلانا ہے۔

پس میری التجا اپنے بھائیوں سے یہ ہے کہ ہمارا خدا نہایت مہربان اور بہت بڑا منصف ہے اور سچا سچائی کا پسند کرنے والا ہے۔ وہ ہمارے دلوں کے بھید جانتا ہے۔ وہ ہماری نیتوں کو پہچانتا ہے۔ پس ہم کو

اپنے مذہب میں نہایت سچائی سے پختہ رہنا مگر تعصب کو جو ایک بری خصلت ہے چھوڑنا چاہیے۔ تمام بنی نوع انسان ہمارے بھائی ہیں۔ ہم کو سب سے محبت اور سچا معاملہ رکھنا اور سب سے سچی دوستی۔ اور سب کی سچی خیر خواہی کرنا ہمارا قدرتی فرض ہے۔ پس اسی کی ہم کو پیروی چاہیے۔

"شہنشاہِ اکبر"

(از پروفیسر محمد حسین آزاد دہلوی)

جن دنوں ہمایوں شیر شاہ کے ہاتھ سے پریشان حال تھا۔ ایک دن ماں نے اُس کی ضیافت کی۔ وہاں ایک نوجوان لڑکی نظر آئی۔ اور دیکھتے ہی اُس کے حُسن وجمال کا عاشق شیدا ہوگیا۔ دریافت کیا تو لوگوں نے عرض کیا کہ حمیدہ بانو بیگم اُس کا نام ہے۔ ایک سیّد بزرگوار شیخ زندہ پیل احمد جام کی اولاد میں ہیں۔ اور آپ کے بھائی مرزا ہندال کے اُستاد ہیں۔ یہ اُن کے خاندان کی بیٹی ہے۔ ہمایوں نے چاہا کہ اُسے عقد میں لائے۔ ہندال نے کہا مناسب نہیں۔ ایسا نہو کہ میرے اُستاد کو ناگوار ہو۔ ہمایوں کا دل ایسا نہ تھا کہ کسی کے سمجھائے

سمجھا جاتا۔ آخر محل میں داخل کر لیا۔

لیکن حضرت عشق نے شادی کی تھی۔ اور محبت کے قاضی نے نکاح پڑھا تھا۔ ہمایوں کو دم بھر جُدائی گوارا نہ تھی۔ دن ایسے نحوست کے تھے کہ ایک جگہ قرار نہ ملتا تھا۔ ابھی پنجاب میں ہے۔ ابھی سندھ میں ہے۔ ابھی بیکانیر جیسلمیر کے ریگستان میں سرگردان چلا جاتا ہے۔ پانی ڈھونڈھتا ہے تو منزلوں تک میسّر نہیں۔ جودھپور کا رخ ہے کہ اُدھر سے امید کی آواز آئی ہے۔ قریب پہنچکر معلوم ہوتا ہے کہ وہ امید نہ تھی۔ دغا آواز بدل کر بول رہی تھی۔ وہاں تو موت مُنہ کھولے بیٹھی ہے۔ ناچار پھر اُلٹے پاؤں پھر آتا ہے۔ یہ سب مصیبتیں ہیں۔ مگر پیاری بی بی دم کے ساتھ ہے۔ کئی لڑائی کے مقاموں میں اس کے سبب سے خطرناک خرابیاں اُٹھانی پڑیں۔ مگر اُسے تعویذ کی طرح گلے سے لگائے پھرا۔ جب وہ جودھپور کے سفر میں تھے تو اکبر ماں کے پیٹ میں باپ کے رنج وراحت کا شریک تھا۔ اس سفر سے پھرے اور سندھ کی طرف آئے۔ ایّام ولادت بہت نزدیک تھے۔ اس لیے بیگم کو امرکوٹ میں چھوڑا اور آپ آگے پُرانی لڑائی کو تازہ کیا۔ اسی عالم میں ایک دن ملازم نے آکر خبر دی کہ مبارک۔ اقبال کا تارا طلوع ہوا۔ یہ ستارا ایسے ادبار کے وقت جھلملایا تھا کہ کسی کی آنکھ اُدھر نہ اٹھی مگر تقدیر ضرور کہتی ہوگی کہ دیکھنا! آفتاب ہو کر چمکے گا۔ اور سارے ستارے

اس کی روشنی میں دھندلے ہوکر نظروں سے غایب ہو جائیں گے۔

ترکوں میں رسم ہی کہ جب کوئی خوش خبری لاتا ہے تو اُسے کچھ دیتے ہیں۔ ایک سفید پوش اشراف ہوگا تو اپنا چغہ ہی اُتار کر دیدے گا۔ امیر ہے تو اپنی دستگاہ کے بموجب خلعت اور گھوڑا۔ نقد وجنس جو جو کچھ ہو سکے گا دیگا۔ سب کی ضیافتیں کرے گا۔ نوکروں کو انعام اکرام سے خوش کرے گا۔ ہمایوں کے پاس جب سوار یہ خبر لایا تو اُس کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ دائیں بائیں دیکھا کچھ نہ پایا۔ آخر یاد آیا کہ کمر میں ایک مشک نافہ ہے۔ اُسے نکال کر توڑا۔ اور ذرا ذرا سا مشک سب کو دیدیا کہ شگون خالی نہ جائے۔ اللہ اللہ۔ تقدیر نے کہا ہوگا کہ دل میلا نہ کیجیو۔ اس بچّے کی شمیم اقبال مشک کی طرح تمام عالم میں پھیلے گی۔ بے سامان بچّے کو جس طرح خدا نے تمام سامان ملک و دولت کے دیئے اُسی طرح ولادت کے وقت ستاروں کو بھی اس نظام کے ساتھ ہر اک بُرج میں واقع کیا کہ آج تک نجومی حیران ہوتے ہیں۔ ہمایوں خود ہیئت اور نجوم کا ماہر تھا۔ اور اُس کے زائچے کو اکثر دیکھا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ کئی باتوں میں امیر تیمور سے بھی زیادہ مبارک ہے۔

اکبر ابھی حمل میں تھا۔ اور میر شمس الدین محمد کی بی بی بھی حاملہ تھیں۔ بیگم نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ میرے یہاں بچّہ ہوگا۔ تو تمھارا دودھ

اُسے دوں گی۔ اتفاق یہ کہ جب اکبر پیدا ہوا تو اُن کے یہاں ابھی کچھ نہ ہوا تھا۔ بیگم نے پہلے آپ دودھ پلایا پھر اُن کے دودھ نہ رہا تو بعض بعض اور بی بیاں بھی دودھ پلاتی رہیں۔ چند روز کے بعد جب اُن کے یہاں بچّہ ہوا تو انھوں نے دودھ پلایا اور زیادہ تر انھیں کا دودھ پیا۔ یہی سبب ہے کہ اکبر انھیں جیجی کہا کرتا تھا۔

ہمایوں سندھ کے ملک میں مدّت تک لڑتا پھرتا رہا کہ شاید قسمت یاوری کرے اور ایسی صورت بن جائے کہ پھر ہندوستان پر فوج کشی کرنے کا سامان بہم پہنچ جائے۔ لیکن نہ تدبیر چلی نہ شمشیر۔ آخر ملک سندھ سے ڈیرے اُٹھائے۔ خیال ہوا کہ فی الحال بولان کی گھاٹی سے نکلکر قندھار کو دیکھنا چاہیے کہ قریب ہی وہاں سے مشہد کا راستہ بھی روشن ہے۔ بلخ و بخارا کی راہ بھی جاری ہے۔ عسکری مرزا اس وقت قندھار میں حکومت کر رہا ہے۔ میں اس قدر حادثے اُٹھاکر آیا ہوں۔ عیال کا ساتھ ہے آخر بھائی ہے۔ جیتا خون کب تک ٹھنڈا رہے گا۔ کچھ بھی حق نہ سمجھا تو مہمانی تو کہیں نہیں گئی۔ چند روز رہکر اُس کا اور نمک خوارانِ قدیم کا رنگ دیکھوں گا۔ بوئے وفا نہ پاؤں گا تو جدھر مُنہ اُٹھے گا چلا جاؤں گا۔ کہ خلقِ خدا ملکِ خدا۔

اسی عالم میں شال کے قریب پہنچا۔ مرزا عسکری کو بھی خبر پہنچ گئی

تھی - رفیقوں کو لے کر چلا کہ بے خبر پہنچکر ہمایوں کو قید کر لے - موقعہ نہ پائے
تو کہے کہ استقبال کو آیا ہوں - غرض نور کا تڑکا تھا کہ سوار ہوا اور پوچھا
کہ ادھر دامنِ کوہ کا رستہ کون جانتا ہی - چپے بہادر ایک اُزبک پہلے
ہمایوں کے وفاداروں کا نوکر تھا - تباہی کے عالم میں مرزا عسکری کے
پاس نوکری کر لی تھی - اُس وقت نمک کی تاثیر چاپ اُٹھی - اور ہمایوں
کی حالت نے اُس کے دل میں غائبانہ رحم پیدا کیا - اُس نے عرض کی -
میں جانتا ہوں اور کئی دفعہ آیا گیا ہوں - مرزا نے کہا سچ کہتا ہے - ادھر
اس کی جاگیر تھی - اچھا آگے آگے چل - اُس نے کہا میرا یابو کام نہیں کرتا -
مرزا نے ایک نوکر سے گھوڑا دلوا دیا - چپے بہادر نے تھوڑی دور آگے
چل کر گھوڑا اُڑایا - اور سیدھا بیرم خاں کے خیمے میں آیا - کان میں کہا
کہ مرزا آن پہنچا ہی - اب فرصت کا وقت نہیں - اور میں قدرتی اتفاق سے
اس طرح پہنچا ہوں - بیرم خاں اُسی وقت چپ چاپ اُٹھکر خیمے کے پیچھے
سے ہمایوں کے پاس آیا اور حال بیان کیا - سوا اس کے اور کیا ہو سکتا تھا
کہ ایران کا ارادہ مصمم کریں - تردی بیگ کے پاس آدمی بھیجا کہ چند گھوڑے
بھیجدو - اس نا اہل نے مروت سے صاف جواب دیا - ہمایوں کو خدا
یاد آیا کہ بھائیوں کا یہ حال - نمک خواروں اور ہمراہیوں کا یہ حال -
جودھپور کے رستے کی بے وفائی اور بے حیائی بھی یاد آگئی - چاہا کہ اس وقت

خود جائے اور اُس کو حد کو پہنچائے۔ بیرم خاں نے عرض کی کہ وقت تنگ ہی۔ بات کی بھی گنجایش نہیں۔ آپ اُن کافر نعمتوں کو قہر الٰہی کے حوالہ کریں۔ اور جلد سوار ہوں۔ اکبر اُس وقت پورا برس دن کا بھی نہیں ہوا تھا۔ اسے میر غزنوی اور خواجہ سرا وغیرہ اور ماہم انکہ کے سپرد کر کے یہیں چھوڑا۔ بیگم تو جان کے ساتھ تھیں۔ وفاداروں سے کہا کہ مرزا کا خدا نگہبان ہی۔ ہم آگے چلتے ہیں۔ بیگم کو کسی طرح تم ہم تک پہنچا دو۔ آپ مخلصان جاں نثار کے ساتھ دشت غربت کو روانہ ہوا۔ پیچھے بیگم بھی آملیں۔

اب اُدھر کی سنو۔ کہ مرزا عسکری جب پہنچا تو بے وارثے قافلے کو دیکھکر بہت اپنی بد نیتی پر پچھتایا۔ نزدی بیگ سب کو لیکر حاضر ہوے۔ مگر سب میں یہ بھی نظر بند ہو گئے۔ میر غزنوی سے پوچھا کہ مرزا (اکبر) کہاں ہیں۔ عرض کی گھر میں ہیں۔ چچا نے ایک اونٹ میوے کا بھتیجے کے لیے بھیجا اور ڈیوڑھی پر آیا کہ بھتیجے سے ملوں گا۔ یہاں رات قیامت کی رات گذری تھی۔ سب کے دل دھکڑ دھکڑ کرتے تھے کہ ماں باپ اُس حال سے گئے۔ ہم ان پہاڑوں میں بے سر و سامان پڑے ہیں۔ بے مروت چچا ہے۔ اور معصوم بچے کی جان ہی اللہ ہی نگہبان ہے۔ میر غزنوی اور ماہم انکہ اکبر کو کندھے سے لگائے سامنے آئی۔ منافق چچا نے گود میں لے لیا۔ اور زہر خند ہنسی سے بول چال کہہ چاہا کہ بچہ ہنسے بولے۔ مگر اکبر کے لبوں پر تبسّم بھی نہ آیا۔

چُپکا مُنہ دیکھا کیا۔ مرزا عسکری کے گلے میں ایک انگوٹھی سُرخ ریشم کے ڈورے میں تھی۔ لال لچھا باہر نظر آتا تھا۔ اکبر نے اُس پر ہاتھ بڑھایا۔ بارے چچا نے اپنے گلے سے اُتار کر بھتیجے کے گلے میں ڈال دی۔ دل شکستہ ہوا خواہوں نے کہا۔ کیا عجب ہے کہ خدا ایک دن اسی طرح سلطنت کی انگوٹھی اس نونہال کی اُنگلی میں پہنا دے۔

غرض مرزا عسکری اکبر کو اپنے ساتھ قندھار لے گیا۔ قلعہ کے اندر ایک بالاخانہ رہنے کو دیا۔ اور سلطان بیگم اپنی بی بی کے سپرد کیا۔ بیگم بڑی محبّت وشفقت سے پیش آتی تھی خدا کی شان دیکھو۔ باپ کے جانی دشمن۔ بیٹے کے حق میں ماں باپ ہو گئے۔ ماہم اور جیجی اندر۔ میر غزنوی باہر خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ یا عنبر خواجہ سرا تھا کہ اکبری اقبال کے دَور میں اعتماد خاں ہو کر بڑا صاحب اختیار رہا۔

ترکوں میں رسم ہے کہ بچّہ جب پانوں چلنے لگتا ہے تو باپ دادا چچا وغیرہ میں سے جو بزرگ موجود ہو وہ اپنے سر سے عمامہ اُتار کر بچّے کو چلتے ہوئے مارتا ہے۔ اس طرح کہ بچہ گر پڑے۔ اور اس کی بڑی خوشی سے شادی کرتے ہیں۔ جب اکبر سوا برس کا ہوا اور پانوں چلنے لگا تو ماہم نے مرزا عسکری سے کہا کہ یہاں تم ہی اس کے باپ کی جگہ ہو۔ اگر یہ رسم ادا ہو جائے تو شفقت بزرگانہ سے بعید نہ ہوگا۔ اکبر کہا کرتا تھا کہ ماہم کا

یہ کہنا اور مرزا عسکری کا عمامہ پھینکنا اور اپنا گرنا وہ ساری صورت حال مجھے اب تک یاد ہے۔ انھیں دنوں میں سر کے بال بڑھانے کو بابا حسن ابدال کی درگاہ میں لے گئے تھے کہ قندھار میں ہے۔ وہ بھی آج تک مجھے یاد ہے۔

جب ہمایوں ایران سے پھرا اور افغانستان میں آمد آمد کا غل ہوا تو مرزا عسکری اور کامران گھبرائے۔ آپس میں دونوں کے نامہ و پیام دوڑنے لگے۔ کامران نے لکھا کہ اکبر کو ہمارے پاس کابل میں بھیجدو۔ مرزا عسکری نے یہاں مشورت کی۔ بعض سرداروں نے کہا کہ بھائی اب پاس آپہنچا ہے۔ اعزاز و اکرام سے بھتیجے کو بھیجدو۔ اور اُسی کو عفو تقصیرات کا وسیلہ قرار دو۔ بعض نے کہا کہ اب صفائی کی گنجایش نہیں رہی۔ مرزا کامران ہی کا کہنا مانیے۔ مرزا عسکری کو بھی یہی مناسب معلوم ہوا۔ اکبر کو سب متعلّقوں کے ساتھ کابل بھیجدیا۔

مرزا کامران نے اُنھیں خانزادہ بیگم اپنی پھوپی کے گھر میں اُتروایا۔ اور ان کے کاروبار بھی انھیں کے سپرد کیے۔ دوسرے دن باغ شہر آرا میں دربار کیا۔ اور اکبر کو بھی دیکھنے کو بلُایا۔ اتفاقاً شب برات کا دن تھا۔ دربار خوب آراستہ کیا تھا۔ وہاں رسم ہے کہ بچّے اُس دن چھوٹے چھوٹے نقاروں سے کھیلتے ہیں۔ مرزا ابراہیم اُس کے بیٹے کے لیے

رنگین ونگارین نقارہ آیا اُس نے لے لیا۔ اکبر بچہ تھا۔ کیا سمجھتا تھا کہ میں کس
حال میں ہوں۔ اور یہ کیا وقت ہے۔ اُس نے کہا کہ یہ نقارہ میں لوں گا۔
مرزا کامران تو پورے حیادار تھے۔ انھوں نے بھتیجے کی دلداری کا ذرا خیال
نہ کیا۔ کہا کہ اچھا۔ دونوں کشتی لڑو۔ جو پچھاڑے اُسی کا نقارہ۔ یہی خیال
کیا ہوگا کہ میرا بیٹا اس سے بڑا ہے۔ مار لے گا۔ یہ شرمندہ بھی ہوگا اور چوٹ
بھی کھائے گا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ہوتے ہیں۔ وہ نونہال
اقبال مندان باتوں کو ذرا خیال میں نہ لایا۔ جھٹ لڑنے کو آگے بڑھا۔
لپٹ کر گتھم گتھا ہو گیا اور ایسا بے لاگ اُٹھا کر مارا کہ دربار سے غل اُٹھا۔
کامران کچھ شرمندہ ہوا اور کچھ اپنے حال کو سوچ کر چپ رہ گیا کہ آثار اچھے
نہیں۔ ادھر والے باغ باغ ہو گئے۔ اور اندر اندر آپس میں یہ کہا کہ
اسے کھیل نہ سمجھو۔ یہ باپ کا دمامۂ دولت لیا ہے۔

جب ہمایوں نے کابل فتح کیا تو اکبر دو برس دو مہینے آٹھ دن کا تھا۔
بیٹے کو دیکھ کر آنکھیں روشن کیں۔ اور خدا کا شکر بجا لایا۔ چند روز کے
بعد تجویز ہوئی کہ ختنے کی رسم ادا کی جائے۔ بیگم وغیرہ حرم سرا کی بی بیاں قندھار
میں تھیں وہ بھی آئیں۔ اس وقت عجب تماشہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ جب ہمایوں
اور اُس کے ساتھ بیگم ایران کو گئے تھے اُس وقت اکبر کی کیا بساط تھی۔ دن
اور مہینوں کا ہوگا۔ اتنی سی جان۔ کیا جانے کہ ماں کون ہے۔ اب جو

سواریاں آئیں تو ان سب کو لاکر محل میں بٹھایا۔ اکبر کو بھی لائے اور کہا جاؤ مرزا! اماں کی گود میں جا بیٹھو۔ بھولے بھالے بچّے نے پہلے تو بیچ میں کھڑے ہوکر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر خواہ دانش خداداد کہو خواہ دل کی کشش کہو۔ خواہ لہو کا جوش کہو۔ سیدھا ماں کی گود میں جا بیٹھا۔ ماں برسوں سے بچھڑی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ گلے سے لگایا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔ اس عمر پر اُس کی سمجھ اور پہچان پر سب کو بڑی بڑی امیدیں ہوئیں۔

سنہ ۹۵۴ء میں جب کامران پھر باغی ہوا تو کابل کے اندر تھا۔ ہمایوں باہر گھیرے پڑا تھا۔ ایک دن دھاوے کا ارادہ تھا۔ باہر سے گولے برسانے شروع کیے۔ اکثر اشخاص کے گھر اور گھر والے اندر تھے۔ خود ہمایوں کے لشکر میں شامل تھے بے درد کامران نے اُن کے گھر لوٹ لیے۔ ننگ و ناموس برباد کیے۔ ان کے بچّوں کو مار مار کر فصیل پر سے پھنکوایا۔ عورتوں کی چھاتیاں باندھ باندھ کر لٹکایا۔ غضب یہ کیا کہ جس مورچے پر گولوں کا زور تھا۔ پونے پانچ برس کے معصوم بھتیجے کو وہاں بٹھایا۔ ماہم نے گود میں دبکا لیا۔ اور اُدھر سے پیٹھ کرکے بیٹھ گئی کہ اگر گولے لگے تو بلا سے پہلے میں پیچھے بچہ۔ ہمایوں کے لشکر میں کسی کو اس حال کی خبر نہ تھی۔ یکایک توپ چلتے چلتے بند ہوگئی۔ کبھی مہتاب دکھائی تو رنجک چاٹ گئی۔ کبھی گولہ اُگل دیا۔ سُنبل خاں میر آتش بڑا تیز نظر تھا۔ اُس نے غور سے دیکھا

تو سامنے آدمی بیٹھا معلوم ہوا۔ دریافت کیا تو یہ حقیقت حال معلوم ہوئی۔

(دربار اکبری)

ابوالفیض فیضی فیاضی

(از پروفیسر محمد حسین آزاد دہلوی)

۹۵۴ھ میں جبکہ ہندوستان کی سلطنت سلیم شاہ کی سلامتی میں متفکر تھی۔ شیخ مبارک شہر آگرہ میں چارباغ کے پاس رہتے تھے کہ نہال امید میں پہلا پھول کھلا۔ اقبال پکارا کہ مراد کا پھل لائیگا۔ کامیاب ہوگا اور کامیابی پھیلائے گا۔ ابوالفیض اس کا نام ہوا۔ معصوم بچہ باپ کی نحوست کے سایہ میں پلا۔ وہ افلاس کی خشک سالی اٹھاتا۔ عداوت اعدا کے کانٹے کھاتا جوانی کی بہار کو پہنچا۔

اس نے علم و فضل کا سرمایہ باپ سے پایا۔ اور علوم عقلی و نقلی جو ایشیا میں مروج تھے۔ ان میں مہارت حاصل کی۔ مگر فن شعر میں جو کمالات دکھائے وہی ثابت کرتے ہیں کہ فیضی کا دل و دماغ فیضان قدرت سے شاداب تھا۔ اور ملک الشعرا اپنی شاعری ساتھ لے کر آیا تھا۔ باپ اگرچہ شاعر نہ تھا۔ لیکن ہمہ داں فاضل تھا بیٹے کے کلام کو دیکھتا تھا۔ اُسے نکتہ نکتہ سے آگاہ کرتا تھا۔ زبان کو فصاحت کی چاٹ لگاتا تھا۔ اور اُس

سے رموز سخن کے سرچشمے کھولتا تھا۔ فن طب کو حاصل کیا۔ مگر اس سے فائدہ فقط اتنا لیا کہ بندگانِ خدا کو معالجہ سے فیض پہنچاتا تھا اور کچھ اُجرت نہ لیتا تھا۔ جب ہاتھ میں زیادہ رسائی ہوئی تو دوا بھی اپنے پاس سے دینے لگا۔ جب خدا نے دستگاہ بڑھائی اور فرصت نے تنگی کی تو رفاہ کی نظر سے ایک شفا خانہ بنوا دیا۔

شیخ فیضی۔ جس کا آئے دن کے صدموں نے قافیہ تنگ کر رکھا تھا اب اُس کی طبیعت ذرا کھلنے لگی۔ شاخِ طبع سے جو پھول جھڑتے اُن کی مہک میدان عالم میں پھیل کر دربار تک پہنچنے لگی۔ سنہ ۹۷۴ھ میں بادشاہی لشکر نے چتّوڑ پر علم اُٹھائے تھے جو کسی تقرب سے دربار میں اس کا ذکر ہوا۔ کمال کے جوہری کو جواہر کے شوق نے ایسا بیقرار کیا کہ فوراً طلب فرمایا۔ دشمن بھی لگے ہی ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے حسنِ طلب کو طلبی عتاب کے پیرایہ میں ظاہر کیا۔ اور حاکم آگرہ کے نام لکھا کہ فوراً گھر سے بلاؤ اور سواروں کے ساتھ روانہ کرو۔ کچھ رات گئی تھی کہ چند ترکوں نے آکر گھر پر غل مچایا۔ انھیں کیا خبر تھی کہ ہم بادشاہ کے شوق کا گلدستہ لینے آئے ہیں یا مجرم کے پکڑنے کو آئے ہیں۔ دشمنوں نے بہادرانِ شاہی کو بہکا دیا تھا کہ شیخ بیٹے کو چھپائیگا اور حیلے حوالے کریگا۔ ڈراوے اور دھمکاوے کے بغیر نہ دیگا۔ اتفاقاً

فیضی باغ میں سیر کو گئے تھے اور اہل حسد کا سارا مطلب یہ تھا کہ وہ ڈر کر بھاگ جاوے۔ کچھ نہ ہو تو شیخ اور اُس کے عیال تھوڑی دیر پریشانی میں تو رہیں۔ شیخ کو خبر ہوئی اُس نے بے تکلّف کہہ دیا کہ گھر میں نہیں۔ سپاہی اُزبک بے عقل۔ نہ خود کسی کو سمجھیں نہ کوئی اُن کی سمجھے۔ اس پر بادشاہی حکم اور شیطانوں نے دل میں وسوسہ ڈالا ہو۔ قریب تھا کہ خناسوں کا وسواس سچ کا روپ بدل کر کچھ فتنہ برپا کردے کہ اتنے میں فیضی بھی آن پہنچے۔ بے حیا۔ بے شرم شرمندہ ہو گئے۔ آمدنی کے رستے بند تھے۔ سفر کا سامان کہاں۔ بارے شاگردوں اور اہل ارادت کی سعی سے یہ مشکل بھی آسان ہو گئی۔ اور رات ہی کو فیضی روانہ ہو گئے۔ گھر اور گھرانے کے لوگ غم میں ڈوب گئے کہ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے۔ کئی دن کے بعد خبر پہنچی کہ خسروِ آفاق نے غریب نوازی فرمائی ہے۔ کچھ خطر کا مقام نہیں۔

وہ بلند خیال شاعر کہ شگفتہ مزاج عالم تھا۔ اپنی شگفتہ بیانی۔ دانشِ خداداد۔ اور فراخ دانی کی بدولت نہایت کم عرصہ میں درجہ مصاحبت تک پہنچ گیا اور چند ہی روز میں ایسا ہو گیا کہ مقام ہو یا سفر۔ کسی عالم میں بادشاہ کو اُس کی جدائی گوارا نہ تھی۔ اس نے [illegible] درجہ کا اعتبار پیدا کیا۔ ابوالفضل بھی دربار میں بُلائے گئے۔ اور

یہ عالم ہوا کہ مہمّاتِ سلطنت میں کوئی بات بغیر ان کی صلاح کے نہ ہوتی۔

فیضی نے کوئی ملکی و مالی خدمت نہیں لی۔ اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ ادھر ہاتھ ڈالتا تو پہلے شاعری سے ہاتھ اُٹھاتا۔ لیکن ملک و مال کے جزوی معاملے اس کی صلاح پر منحصر تھے۔

جو شاہزادہ پڑھنے لکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ اکبر اُس کی اُستادی سے فیضی کو اعزاز دیتا تھا۔ کہ تعلیم و تربیت کرو چنانچہ سلیم۔ مراد۔ دانیال سب اس کے شاگرد تھے اور اسے بھی اس امر کا بڑا فخر تھا۔

سلاطین چغتائیہ میں ملک الشعرا کا خطاب سب سے اول غزالی شہیدی کو ملا ہے۔ اس کے بعد شیخ فیضی کو ملا۔ یہ خطاب بھی اُس نے اپنی درخواست سے نہ لیا تھا۔ اُس کو اعلیٰ درجہ کی قربت اور اقتدار حاصل تھا۔ مگر اس نے کسی منصب یا حکومت کی ہوس نہ کی۔ ملکِ سخن کی حکمرانی خدا سے لایا تھا۔ اسی پر قانع تھا۔ اور یہ کچھ تھوڑی نعمت تو نہیں تھی۔ اکبر اُس کو اور اُس کے مرصع کلام کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ بلکہ اُس کی بات بات کو خلعت اور دربار کا سنگار جانتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ دونوں بھائی ہر خدمت کو ایسی سنجیدگی اور خوبصورتی سے بجا لاتے ہیں کہ جو اس کے لیے مناسب ہی۔ اس سے بھی بہتر

درجہ پر پہنچا دیتے ہیں اور ہر کام کو جانفشانی اور دلی عرق ریزی سے بجالاتے ہیں اس واسطے اپنی ذات سے انھیں وابستہ سمجھتا تھا۔ اور بہت خاطرداری اور دلداری سے کام لیتا تھا۔ فیضی کو کچھ فرمایش کی تھی یہ حضور میں کھڑے لکھ رہے تھے۔ اکبر چپ تھا اور ان کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتا تھا۔ بیربھی بڑے منہ چڑھے ہوئے تھے۔ انھوں نے کچھ بات کی۔ اکبر نے آنکھ سے منع کیا اور کہا "مت بولو" شیخ جیو کچھ لکھ رہے ہیں" اس فقرے سے اور وقت اخیر کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ انھیں شیخ جیو (شیخ جی) کہا کرتا تھا۔

اخیر میں سب سے دل اُٹھا لیا تھا۔ اور مرض بھی کئی جمع ہو گئے تھے دونوں بالکل چپ رہے۔ شاہ دانش نواز خود خبر کو آئے۔ پکارا تو آنکھ کھولی۔ آداب بجالائے مگر کچھ کہہ نہ سکے۔ دیکھ کر رہ گئے۔

ہائے افسوس! اس موقع پر حکم بادشاہی کا کیا زور چل سکتا تھا۔ انھوں نے بھی رنج کھایا۔ اور آنسو پی کر چلے گئے۔ ۱۰ صفر ۱۰۰۴ھ تھی جو فضل وکمال کے گھر سے نالہ ماتم کا شور اٹھا۔ شعر وسخن نے نوحہ خوانی کی کہ لفظوں کا صراف اور معنی کا مرصع کار مر گیا۔

ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں " آدھی رات تھی۔ اور وہ حالت نزع میں تھا کہ بادشاہ خود آئے۔ بیہوش تھا۔ محبت سے اس کا

سر پکڑ کر اُٹھایا۔ اور کئی دفعہ پُکار پکار کر کہا۔ شیخ جیو۔ ہم حکیم علی کو ساتھ لائے ہیں۔ تم بولتے کیوں نہیں۔ بیہوش تھا۔ صدا ندا کچھ نہ تھی۔ دوبارہ پوچھا تو پگڑی زمین پر دے ماری۔ آخر شیخ ابوالفضل کو تسلّی دیکر چلے گئے۔ ساتھ ہی خبر پہنچی کہ اُس نے اپنے تئیں حوالہ کر دیا (مر گیا)

(دربار اکبری)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شہرتِ عام اور بقاءِ دوام کا دربار

(از پروفیسر مولوی محمد حسین آزاد)

خواب میں دیکھتا ہوں کہ گویا میں ہوا کھانے چلا ہوں اور چلتے چلتے ایک میدان وسیع الفضا میں جا نکلا ہوں جسکی وسعت اور دلفزائی میدان خیال سے بھی زیادہ ہے۔ دیکھتا ہوں کہ میدان مذکور میں اسقدر کثرت سے لوگ جمع ہیں کہ نہ انھیں محاسبِ فکر شمار کر سکتا ہے نہ قلم فہرست تیار کر سکتا ہے۔ اور جو لوگ اس میں جمع ہیں وہ غرض مند لوگ ہیں کہ اپنی اپنی کامیابی کی تدبیروں میں لگے ہوے ہیں۔ وہاں ایک پہاڑ ہے جس کی

چوٹی گوشِ پنجاب سے سرگوشیاں کر رہی ہی۔ پہلو اس کے جس طرف
سے دیکھو ایسے سر پھوڑ اور سینہ توڑ ہیں کہ کسی مخلوق کے پاؤں نہیں جمنے
دیتے۔ ہاں حضرتِ انسان کے ناخنِ تدبیر کچھ کام کر جائیں تو کر جائیں۔
میرے دوستو! اس رستہ کی دشواریوں کو سر پھوڑ اور سینہ توڑ پہاڑوں
سے تشبیہہ دیکر ہم خوش ہوتے ہیں مگر نا منصفی ہے۔ پتھر کی چھاتی اور
لوہے کا کلیجہ کر لے تو اِن بلاؤں کو جھیلے۔ جن پر وہ مصیبتیں گذریں وہی
جانیں۔ یکایک قلعۂ کوہ سے ایک شہنائی کی سی آواز آنی شروع ہوئی۔
یہ دلکش آواز سب کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی تھی اس طرح کہ دل میں
جان اور جان میں زندہ دلی پیدا ہوتی تھی بلکہ خیال کو وسعت کے ساتھ
ایسی رفعت دیتی تھی جس سے انسان مرتبۂ انسانیت سے بھی بڑھکر
قدم مارنے لگتا تھا۔ لیکن یہ عجب بات تھی کہ اتنے انبوہ کثیر میں سے تھوڑے
ہی اشخاص تھے جن کے کان سننے کی قابلیت یا اس کے نغموں کا مذاق
رکھتے تھے۔

ایک بات کے دیکھنے سے مجھے نہایت تعجب ہوا۔ اور وہ تعجب
فوراً جاتا بھی رہا۔ یعنی دوسری طرف جو نظر جا پڑی تو دیکھتا ہوں کہ کچھ
خوبصورت عورتیں ہیں اور بہت سے لوگ ان کے تماشائے جمال میں
محو ہو رہے ہیں۔ یہ عورتیں پریوں کا لباس پہنے ہیں۔ مگر یہ بھی وہیں

چرچا سُنا کہ درحقیقت نہ وہ پریاں ہیں نہ پری زاد عورتیں ہیں۔
کوئی ان میں **غفلت** کوئی **عیّاشی** ہے۔ کوئی **خودپسندی** کوئی **بے پروائی** ہے۔ جب کوئی ہمّت والا ترقی کے رستہ میں سفر کرتا ہے تو یہ ضرور ملتی ہیں۔ انھیں میں پھنس کر اہلِ ترقی اپنے مقاصد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان پر درختوں کے جھنڈ سایہ کیے ہوئے تھے۔ رنگ برنگ کے پھول کھلے تھے۔ گوناگوں جھوم رہے تھے۔ طرح طرح کے جانور بول رہے تھے۔ نیچے قدرتی نہریں اوپر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ وہیں دانش فریب پریاں پتھروں کی سلوں پر پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں اور آپس میں چھینٹیں لڑ رہی تھیں مگر ایسے ایسے اُلجھاوے بلندی کوہ ادھر ہی ادھر تھے۔ یہ بھی صاف معلوم ہوتا تھا کہ جو لوگ ان جعلی پریوں کی طرف مایل ہیں وہ اگرچہ اقوام مختلفہ۔ عہدہائے متفرقہ۔ عمرہائے متفاوتہ رکھتے ہیں مگر وہی ہیں جو حوصلہ کے چھوٹے ہمّت کے ہیٹے اور طبیعت کے پست ہیں۔

دوسری طرف دیکھا کہ جو بلند حوصلہ صاحب ہمّت عالی طبیعت تھے وہ ان سے الگ ہوگئے اور غول کے غول شہنائی کی آواز کی طرف بلندیِ کوہ پر متوجّہ ہوئے جس قدر یہ لوگ آگے بڑھتے تھے اُسی قدر وہ آواز کانوں کو خوش آیند معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ بہت سے

چیدہ اور برگزیدہ اشخاص اس ارادے سے آگے بڑھے کہ بلندئ کوہ پر چڑھ جائیں۔ اور جس طرح ہو سکے پاس جاکر اس نغمۂ آسمانی سے قوتِ روحانی حاصل کریں۔ چنانچہ سب لوگ کچھ کچھ چیزیں اپنے اپنے ساتھ لینے لگے۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آگے کے راستہ کا سامان لے رہے ہیں۔ سامان بھی ہر ایک الگ الگ تھا۔ کسی کے ایک ایک ہاتھ میں کاغذوں کے اجزا رتھے۔ کسی کی بغل میں ایک کمپاس تھی۔ کوئی پنسلیں لیے تھا۔ کوئی جہازی قطب نما اور دوربین سنبھالے تھا۔ بعضوں کے سر پر تاجِ شاہی دھرا تھا بعضوں کے تن پر لباس جنگی آراستہ تھا۔ غرضکہ علم ریاضی اور جر ثقیل کا کوئی آلہ نہ تھا جو اس وقت کام میں نہ آ رہا ہو اسی عالم میں دیکھتا ہوں کہ ایک فرشتۂ رحمت میرے داہنے ہاتھ کی طرف کھڑا ہی اور مجھے بھی اس بلندی کا شائق دیکھکر کہتا ہی کہ یہ سرگرمی اور گرم جوشی تمھاری ہمیں نہایت پسند ہی اس نے یہ بھی صلاح دی کہ ایک نقاب منہ پر ڈال لو میں نے بے تامل تعمیل کی۔ بعد اس کے گروہ مذکور فرقہ فرقہ میں منقسم ہو گیا کوہ مذکور پر رستوں کا کچھ شمار نہ تھا۔ سب نے ایک ایک راہ پکڑ لی۔ چنانچہ کچھ لوگوں کو دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں پر ہو لیے۔ وہ تھوڑے ہی دور چڑھے تھے کہ اُن کا راستہ ختم ہوا اور وہ تھم گئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ان پست ہمتوں نے صنعت گری اور دستکاری کی راہ لی تھی کہ روپیہ

کے بھوکے تھے اور جلد محنت کا صلہ چاہتے تھے - میں ان لوگوں کے پیچھے
تھا کہ جنھوں نے دلاوروں اور جاں بازوں کے گروہ کو پیچھے چھوڑا
تھا اور خیال کیا تھا کہ چڑھائی کے رستے ہم نے پا لیے مگر وہ رستے ایسے
پیچ در پیچ اور درہم برہم معلوم دیے کہ تھوڑا ہی آگے بڑھکر اس کے
ہیر پھیر میں سرگرداں ہو گئے - ہرچند برابر قدم مارے جاتے
تھے مگر جب دیکھا تو بہت کم آگے بڑھتے تھے - میرے فرشتۂ رحمت
نے ہدایت کی کہ یہ وہی لوگ ہیں جہاں عقل صادق اور عزم کامل
کام دیتا ہے وہاں چاہتے ہیں فقط چالاکی سے کام کر جائیں - بعضے
ایسے بھی تھے کہ بہت آگے بڑھ گئے تھے مگر ایک ہی قدم ایسا
بے موقعہ پڑا کہ جتنا گھنٹوں میں بڑھے تھے اتنا دم بھر میں نیچے
آن پڑے - بلکہ بعضے ایسے ہو گئے کہ پھر چڑھنے کے قابل ہی نہ رہے
اس سے وہ لوگ مراد ہیں کہ جو مدد روزگار سے ترقیاں[۱] حاصل
کرتے چلے جاتے ہیں مگر کوئی ایسی حرکت ناشایستہ کرتے ہیں کہ دفعتہً
گر پڑتے ہیں اور آیندہ کے لیے بالکل اس سے علاقہ ٹوٹ جاتا ہے -

---

[۱] فی الحقیقۃ جو ناموری اور ترقّی کے خواہاں ہیں اگر سلطنت - حکومت - دولت شجاعت علمیت وغیرہ کے رستے سے چاہتے ہیں تو خوف جان ہے اگر اور فنون کمال کے رستے لیتے ہیں تو حاسد انواع و اقسام کی بدذاتیوں سے سدّ راہ ہوتے ہیں -

ہم اتنے عرصے میں بہت اونچے چڑھ گئے اور معلوم ہوا کہ جو چھوٹے بڑے
رستے پہاڑ کے نیچے سے چلتے ہیں اوپر آکر دو شاہراہوں سے ملتے
ہیں۔ چنانچہ وہاں آکر تمام صاحب ہمّت دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔
ان دونوں شاہراہوں میں ذرا ذرا آگے بڑھکر ایک ایک بھوت
ڈراؤنی صورت ہیبت ناک مورت کھڑا تھا کہ آگے جانے سے
روکتا تھا۔ بھوت کا نام **دیو ہلاک** تھا اور کانٹے وہی ترقّی
کے مانع اور موت کے بہانے تھے۔ جو الوالعزموں کو راہ ترقّی میں پیش
آتے ہیں چنانچہ جو سامنے آتا تھا ٹھنے کی مار منہ پر کھاتا تھا۔ دیو کی شکل
ایسی خونخوار تھی گویا موت سامنے کھڑی ہے۔ ان کانٹوں کی مار سے
غول کے غول اہل ہمّت کے بھاگ کر پیچھے ہٹتے تھے اور ڈر
ڈر کر چلاتے تھے کہ ہی ہی موت! ہی ہی موت!! دوسرے رستہ پر
جو بھوت تھا اُس کا نام **حسد** تھا۔ پہلے بھوت کی طرح اس کے ہاتھ
میں کچھ نہیں تھا لیکن ڈراؤنی آواز اور بھونڈی صورت اور مکروہ و معیوب
کلمے جو اُس کی زبان سے نکلتے تھے اس لیے اُس کا منہ ایسا بُرا معلوم
ہوتا تھا کہ اُس کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا اُس کے سامنے ایک کیچڑ کا حوض
بھرا تھا کہ برابر چھینٹیں اُڑائے جاتا تھا اور ہر ایک سفید پوش کے کپڑے
خراب کرتا تھا۔ جب یہ حال دیکھا تو اکثر اشخاص ہم میں سے نئے دل

ہوکر رہ گئے اور بعضے اپنے یہاں تک آنے پر کمال نادم ہوے۔
میرا یہ حال تھا کہ یہ خطرناک حالتیں دیکھ دیکھ کر دل ہراساں ہوا جاتا تھا اور
قدم آگے نہ اُٹھتا تھا۔ اتنے میں اس شہنائی کی آواز اس تیزی کے ساتھ
کان میں آئی کہ بجھے ہوے ارادے پھر چپ اُٹھے۔ جس قدر کہ دل
زندہ ہوے اسی قدر خوف و ہراس خاک ہو ہو کر اُڑتے گئے۔ چنانچہ بہت
سے جاں باز جو شمشیر بن علم کیے ہوے تھے اس کڑک دمک سے
قدم مارتے آگے بڑھے گویا حریف سے میدان جنگ مانگتے ہیں۔
یہاں تک کہ جہاں دیو کھڑا تھا یہ اُس دہانہ سے نکل گئے اور وہ
موت کے دانت نکالے دیکھتا رہ گیا۔ جو لوگ سنجیدہ مزاج اور طبیعت
کے دھیمے تھے وہ اس رستے پر پڑے جدھر حسد کا بھوت کھڑا تھا
مگر اس آواز کے ذوق شوق نے انھیں بھی ایسا مست کیا کہ گالیاں کھاتے
کیچڑ میں نہاتے مرپچ کر یہ بھی اُس کی حد سے نکل گئے چنانچہ جو کچھ رستے
کی صعوبتیں اور خرابیاں تھیں وہ ان بھوتوں ہی تک تھیں آگے دیکھا
تو ان کی دست رس سے باہر ہیں اور رستہ بھی صاف اور ہموار بلکہ ایسا
خوشنما ہی کہ مسافر چلا آئے بڑھے اور ایک سپاٹے میں پہاڑ کی
چوٹی پر پہنچ جائے اس میدان روح افزا میں پہنچتے ہی ایسی جاں بخش
اور روحانی ہوا چلنے لگی جس سے روح اور زندگانی کو قوت دوامی حاصل

ہوئی تھی - تمام میدان جو نظر کے گردوپیش دکھائی دیتا تھا اُس کا رنگ کبھی نورِ سحر تھا اور کبھی شام وشفق - جس سے قوس قزح کے رنگ میں کبھی شہرتِ عام اور کبھی بقائے دوام کے حروف عیاں تھے اور نور وسرور کا عالم دل کو اس طرح تسلّی وتشفّی دیتا تھا کہ خود بخود پچھلی محنتوں کے غبار دل سے دھوئے جاتے تھے - اور اس مجمع عام میں امن و امان اور دلی آرام پھیلتا تھا جس کا سرور لوگوں کے چہروں سے پھولوں کی شادابی ہوکر عیاں تھا - ناگہاں ایک ایوان عالی شان دکھائی دیا کہ اُس کے چار طرف پھاٹک تھے - اُس پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا کہ پھولوں کے تختہ میں ایک پری حور شمایل چاندی کی کُرسی پر بیٹھی ہے اور وہی شہنائی بجا رہی ہے جس کے میٹھے میٹھے سُروں نے ان مشتاقوں کے انبوہ کو یہاں تک کھینچا تھا - پری ان کی طرف دیکھکر مسکراتی تھی اور سُروں سے اب ایسی صدا آتی تھی گویا آنے والوں کو آفریں وشاباش دیتی ہے اور کہتی ہے کہ "خیر مقدم! خیر مقدم!! خوش آمدید صفا آوردید" اس آواز سے یہ خدائی لشکر کئی فرقوں میں منقسم ہوگیا - چنانچہ مورّخوں کا گروہ ایک دروازہ پر ایستادہ ہوا تاکہ صاحب مراتب اشخاص حسب مدارج ایوان جلوس میں داخل کرے - یکایک وہ شہنائی جس سے کبھی شوق انگیز وجوش خیز اور کبھی جنگی باجوں کے سُر نکلتے تھے - اب اُس سے

ظفر یابی اور مبارکبادی کی صدا آنے لگی۔ تمام مکان گونج اُٹھا۔ اور دروازے
خود بخود کھل گئے جو شخص سب سے پہلے آگے بڑھا معلوم ہوا کہ کوئی راجوں
کا راجہ مہاراجہ ہے۔ چاند کی روشنی چہرہ کے گرد ہالہ کیے ہے۔ سر پر سورج
کی کرن کا تاج ہے۔ اس کے استقلال کو دیکھکر لنکا کا کوٹ پانی پانی
ہوا جاتا ہے اُس کی حق داری جنگل اور پہاڑوں کے حیوانوں کو جان نثاری
میں حاضر کرتی ہے۔ تمام دیوی دیوتا دامنوں کے سایہ میں لیے آتے
ہیں۔ فرقہ فرقہ کے علما اور مورّخ اسے دیکھتے ہی شاہانہ طور سے لینے کو
بڑھے اور وہ بھی متانت اور انکسار کے ساتھ سب سے پیش آیا۔ مگر
ایک شخص کہن سالہ رنگت کا کالا ایک پوتھی بغل میں لیے ہندوؤں کے
غول سے نکلا اور باواز بلند چلّایا کہ آنکھوں والو کچھ خبر ہے؟ دیکھو! دیکھو!!
ترتیب کے سلسلہ کو برہم نہ کرو اور نرنکار کے نور کو اجسام خاک میں
نہ ملاؤ۔ یہ کہکر آگے بڑھا اور اپنی پوتھی نذر گزرانی۔ اُس نے نذر قبول
کی اور نہایت خوشی سے اس کے لینے کو ہاتھ بڑھایا تو معلوم ہوا کہ اس
کا ہاتھ بھی فقط سورج کی کرن تھا۔ سب ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے۔
کوئی کچھ سمجھا کوئی کچھ سمجھا اُس وقت ایک بان یعنی تخت ہوا دار آیا
وہ اس پر سوار ہوکر آسمان کو اُڑگیا معلوم ہوا کہ یہ **رامچندر جی** تھے
اور یہ **والمیک** ہے جس نے رامائن نذر دی۔ سب لوگ ابھی

والمیاک کی ہدایت کا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک اور آمد آمد ہوئی۔ دیکھا کہ ایک تخت طلسمات کو ۲-۳ پریاں اُڑائے لیے آتی ہیں اس پر ایک اور راجہ بیٹھا ہے مگر نہایت دیرینہ سال۔ اسے فرقہ فرقہ کے علما اور مورخ لینے کو نکلے مگر پنڈت اور مہاجن لوگ بہت بیقراری سے دوڑے معلوم ہوا کہ راجہ تو مہاراجہ **بکرماجیت** تھے اور تخت سنگھاسن بتیسی، پریاں اتنی بات کہکر ہوا ہوگئیں کہ جب تک سورج کا سونا اور چاند کی چاندی چمکتی ہے نہ آپ کا سنہ ہٹے گا نہ سکّہ مٹے گا۔ برہمنوں اور پنڈتوں نے تصدیق کی اور انھیں لے جاکر ایک مسند پر بٹھا دیا۔

ایک راجہ کے آنے پر لوگوں میں کچھ قیل وقال ہوئی کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ اپنے دو مصاجوں کو بھی ساتھ لے جائے۔ اور ارکینِ دربار کہتے تھے کہ یہاں **تمکنت** اور **غرور** کا گذارہ نہیں۔ اتنے میں وہی ۲- ۳ پریاں پھر آئیں۔ چنانچہ ان کی سفارش سے اُسے بھی لے گئے۔ جس وقت راجہ نے مسند پر قدم رکھا ایک پنڈت آیا دونوں ہاتھ اُٹھاکر اشیرباد کہی اور **بقائے دوام** کا تاج سر پر رکھدیا جس میں ہیرے اور پنّے کے نو دانے ستاروں پر آنکھ مار رہے تھے معلوم ہوا کہ وہ راجہ **بھوج** تھے اور بتیس[۳۲] پریوں کا جھرمٹ وہی

کتاب سنگھاسن بتیسی بھی جوانؔ کے عہد میں تصنیف ہوئی اور
جس نے تاج سر پر رکھا وہ کالی داس شاعر تھا جس نے اُن کے
عہد میں نو کتابیں لکھکر فصاحت اور بلاغت کو زندگیِ جاوید بخشی۔ اس
طرف تو برابر یہی کاروبار جاری تھے۔ اتنے میں معلوم ہوا کہ دوسرے
دروازہ سے بھی داخلہ شروع ہوا۔ میں اُس طرف متوجّہ ہوا۔ دیکھتا ہوں
کہ وہ کمرہ بھی فرش و فروش و جھاڑ فانوس سے بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ ایک
جوان ہیل پیکر ہاتھ میں گرزِ گاو سر نشۂ شجاعت میں مست جھومتا
جھامتا چلا آتا ہے۔ جہاں قدم رکھتا ہے ٹخنہ تک زمین میں ڈوب
جاتا ہے گرد اُس کے شاہان کیانی و پہلوان ایرانی موجود ہیں۔ کہ
درفش کاویانی کے سایۂ بے زوال میں لیے آتے ہیں۔ حُبِّ قوم
اور حُبِ وطن اُس کے دائیں اور بائیں پھول برساتے تھے اُس کی نگاہوں
سے شجاعت کا خون ٹپکتا تھا اور سر پر کلہ شیر کا خود فولادی دھرا تھا مورخ
اور شعرا اس کے انتظار میں دروازہ پر کھڑے تھے۔ سب نے اُسے
بچشمِ تعظیم دیکھا انھیں میں سے ایک پیر مردِ دیرینہ سال جس کے چہرے
سے مایوسی اور ناکامی کے آثار آشکارا تھے وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا
اور ایک کرسی پر بٹھایا۔ جسے بجائے پایوں کے چار شیر کندھوں پر اُٹھائے
ہوئے تھے۔ پھر پیر مرد نے اہلِ مجلس کی طرف متوجّہ ہو کر چند اشعار

نہایت زور وشور کے پڑھے نہیں بلکہ اُس کے کارناموں کی تصویر صفحۂ ہستی پر ایسے رنگ سے کھینچی جو قیامت تک رہے گی۔ بہادر پہلوان نے اُٹھکر اُس کا شکریہ ادا کیا اور گلِ فردوس کا ایک طرّہ اُس کے سر پر آویزاں کر کے دعا کی کہ الٰہی یہ بھی قیامت تک شگفتہ اور شاداب رہے تمام اہلِ محفل نے آمین کہی۔

معلوم ہوا کہ وہ بہادر ایران کا حامی زبرستانی **رستم** پہلوان ہے اور کہن سال مایوس **فردوسی** ہے جو **شاہ نامہ** لکھکر اُس کے انعام سے محروم رہا۔

بعد اُس کے ایک نوجوان آگے بڑھا جس کا حسن شباب نوخیز اور دل بہادری اور شجاعت سے لبریز تھا۔ سر پہ تاج شاہی تھا مگر اُس سے ایرانی پہلوانی پہلو چُرا اتی تھی۔ ساتھ اُس کے **حکمت** یونانی سر پہ چھتر لگائے تھی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا۔ مگر سب اُسے دیکھکر ایسے محو ہوئے کہ کسی نے جواب نہیں دیا۔ بہت سے مورّخ اور محقّق اُس کے لینے کو بڑھے مگر سب ناواقف تھے۔ وہ اُس تخت کی طرف سے چلے جو کہانیوں اور افسانوں کے ناموروں کے لیے تیاّر ہوا تھا۔ چنانچہ ایک شخص جس کی وضع اور لباس سب سے علیحدہ تھا ایک انبوہ کو چیر کر نکلا وہ کوئی یونانی مورخ تھا۔ اُس نے اِس کا ہاتھ پکڑ لا اور اندر

لیجا کر سب سے پہلی کرسی پر بٹھا دیا۔ فرشتۂ رحمت نے میرے کان میں کہا کہ تم اس گوشہ کی طرف آجاؤ تاکہ تمہاری نظر سب پر پڑے اور تمھیں کوئی نہ دیکھے۔ یہ **سکندر یونانی** ہے جس کے کارنامے لوگوں نے **کہانی** اور **افسانے** بنا دیئے ہیں۔

اس کے پیچھے ایک بادشاہ آیا کہ سر پر کلاہ کیانی اور اس پر درفش کاویانی جھومتا تھا مگر پھریرا علم کا پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس طرح آتا تھا گویا اپنے زخم کو بچائے ہوئے آتا ہے۔ رنگ زرد تھا اور شرم سے سر جھکائے تھا۔ جب وہ آیا تو **سکندر** بڑی عظمت کے ساتھ استقبال کو اُٹھا اور اپنے برابر بٹھا لیا باوجود اس کے سکندر جس قدر زیادہ تعظیم کرتا تھا اس کی شرمندگی زیادہ ہوتی تھی وہ **دارا** بادشاہ ایران تھا۔

دفعتہً سکندر نے آواز دی "انھیں لاؤ" جو شخص داخل ہوا وہ ایک پیرمرد بزرگ صورت تھا کہ بنفشی داڑھی کے ساتھ بڑھاپے کے نور نے اس کے چہرے کو روشن کیا تھا۔ ہاتھ میں عصائے پیری تھا۔ جس وقت وہ آیا سکندر خود اُٹھا اس کا ہاتھ پکڑ کر لایا۔ اپنے برابر کرسی پر بٹھایا اور پانچ لڑی کا سہرا اس کے سر پر باندھا معلوم ہوا کہ یہ **نظامی گنجوی** ہیں اور اس سہرے میں خمسہ کے مضامین سے پھول پروئے ہوئے ہیں۔ سکندر پھر اُٹھا اور تھوڑا سا پانی اُس پر چھڑک کر کہا وہ اب یہ کبھی نہ کملائیں گے"

بعد اس کے جو شخص آیا اگرچہ سادہ وضع تھا مگر قیافہ اور روشن چہرہ فرحت روحانی سے شگفتہ نظر آتا تھا۔ جو لوگ اب تک آچکے تھے اُن سب سے زیادہ عالی رتبہ کے لوگ اُس کے ساتھ تھے۔ اُس کے داہنے ہاتھ پر **افلاطون** تھا اور بائیں پر **جالینوس** اُس کا نام **سقراط** تھا۔ چنانچہ وہ بھی ایک مسند پر بیٹھ گیا۔

لوگ ایسا خیال کرتے تھے کہ ارسطو اپنے اُستاد یعنی **افلاطون** سے دوسرے درجہ پر بیٹھے گا۔ مگر اس مقدمہ پر کچھ اشخاص تکرار کرتے نظر آئے کہ اُس کا سرگروہ خود ارسطو تھا۔ اس منطقی زبردست نے کچھ شوخی اور کچھ سینہ زوری سے مگر دلایل زبردست اور براہین معقول کے ساتھ سب اہل محفل کو قائل کیا اور کہا کہ یہ مسند میرا ہی حق ہے اور یہ کہکر اول سکندر کو آئینہ دکھایا پھر **نظامی** کو سلام کرکے بیٹھ گیا۔

ایک گروہ کثیر بادشاہوں کے ذیل میں آیا سب جُبّہ و عمامہ اور طبل و دمامہ رکھتے تھے۔ مگر باہر روکے گئے۔ کیونکہ ہرچند اُن کے جُبّے دامن قیامت سے دامن باندھے۔ اور عمامے گنبد فلک کا نمونہ تھے مگر اکثر اُن میں طبل تہی کی طرح اندر سے خالی تھے۔ چنانچہ دو شخص اندر آنے کے لیے منتخب ہوے اُن کے ساتھ ایک انبوہ کثیر علما و فضلا کا ہو لیا تعجب یہ کہ روم و **یونان** کے فلسفی ٹوپیاں اُتارے اُن کے ساتھ تھے

بلکہ چند ہندو بھی تقویم کے پترے لیے اشیر باد کہنے آئے تھے۔ پہلا بادشاہ ان میں **ہارون الرشید** اور دوسرا **مامون الرشید** تھا۔

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ ایک اور تاجدار سامنے سے نمودار ہوا۔ ولایتی **استخواں** اور ولایتی لباس تھا اور جامہ خون سے قلم کار تھا۔ ہندوستان کے بہت سے گراں بہا زیور اُس کے پاس تھے۔ مگر چونکہ ناواقف تھا اس لیے کچھ زیور ہاتھ میں لیے تھا کچھ کندھے پر پڑے تھے۔ ہر چند یہ جواہرات اپنی آبداری سے پانی ٹپکاتے تھے مگر جہاں قدم رکھتا تھا بجائے غبار کے آہوں کے دھوئیں اُٹھتے تھے۔ وہ **محمود غزنوی** تھا۔ بہت سے مصنف اُس کے استقبال کو بڑھے مگر وہ کسی اور کا منتظر اور مشتاق معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک نوجوان حور شمائل آیا اور **فردوسی** کا ہاتھ پکڑ کر محمود کے سامنے لے گیا۔ محمود نے نہایت اشتیاق اور شکر گزاری سے ہاتھ اُس کا پکڑا۔ اگرچہ برابر بیٹھ گئے مگر دونوں کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ نوجوان ایک عجیب ناز و انداز سے مسکرایا اور چلا گیا وہ **ایاز** تھا۔ اسی عرصہ میں ایک اور شخص آیا کہ لباس اہلِ اسلام کا رکھتا تھا مگر چال ڈھال یونانیوں سے ملاتا تھا۔ اس کے داخل ہونے پر شعرا تو الگ ہو گئے مگر تمام علما اور فضلا میں تکرار اور قیل و قال کا غُل ہوا۔ اُس سینہ زور نے سب کو پیچھے چھوڑا اور ارسطو کے مقابل میں ایک کرسی بچھی تھی اُس پر آ کر بیٹھ گیا وہ **بو علی سینا** تھا۔

ایک انبوہ کثیر ایرانی تورانی لوگوں کا دیکھا کہ سب معقول اور خوش وضع لوگ تھے مگر انداز ہر ایک کے جدا جدا تھے۔ بعض کے ہاتھوں میں اجزا اور بعض کی بغل میں کتاب تھی کہ اوراق اُن کے نقش و نگار سے گلزار تھے۔ وہ دعوے کرتے تھے کہ ہم معانی و مضامین کے مصوّر ہیں۔ اُن کے باب میں بڑی تکراریں ہوئیں۔ آخر یہ جواب ملا کہ تم مصوّر نے شک اچھّے ہو مگر بے اصل اور غیر حقیقی اشیاء کے مصوّر ہو۔ تمھاری تصویروں میں اصلیت اور واقعیت کا رنگ نہیں۔ البتہ انتخاب ہو سکتا ہے یہ لوگ فارسی زبان کے شاعر تھے۔ چنانچہ **انوری۔ خاقانی۔ ظہیر فاریابی** وغیرہ چند اشخاص منتخب ہو کر اندر آئے باقی سب لوگ نکالے گئے۔

ایک شاعر کے کان پر قلم دھرا تھا۔ اُس میں سے آبِ حیات کی بوندیں ٹپکتی تھیں مگر کبھی کبھی اس میں سے سانپ کی زبانیں لہراتی نظر آتی تھیں۔ اس لیے اس پر پھر تکرار ہوئی اُس نے کہا کہ بادشاہوں کو خدا نے دفع اعدا کے لیے تلوار دی ہے مگر ملک مضامین کے حاکم سوائے قلم کے کوئی حربہ نہیں رکھتے۔ اگر چند بوندیں زہر آب کی بھی نہ رکھیں تو اعدائے بدنہاد ہمارے خون عزت کے بہانے سے کب چوکیں۔

چنانچہ یہ عذر اُن کا قبول ہوا۔ یہ **انوری** تھا جو باوجود گل افشانیِ فصاحت کے بعض موقع پر اسقدر ہجو کرتا تھا کہ کان اُس کے سننے کی تاب نہیں

رکھتے۔ خاقانی پر اس معاملہ میں اُس کے اُستاد کی طرف سے دعوے پیش ہوئے۔ چونکہ اُس کی بنیاد خانگی نزاع پر تھی اس لیے وہ بھی اُس کی کرسی نشینی میں خلل انداز نہ ہوسکا۔ اسی عرصہ میں چنگیز خاں آیا۔ اُس کے لیے گو علما اور شعرا میں سے کوئی آگے نہ بڑھا بلکہ جب اندر لائے تو خاندانی بادشاہوں نے اُسے چشم حقارت سے دیکھکر تبسم کیا۔ البتہ مورخوں کے گروہ نے بڑی دھوم دھام کی جب کسی کی زبان سے نسب نامہ کا لفظ نکلا تو اُس نے فوراً شمشیر جوہردار سند کے طور پر پیش کی جس پر خونی حرفوں سے رقم تھا "سلطنت میں میراث نہیں چلتی" علما نے غل مچایا کہ جس کے کپڑوں سے لہو کی بُو آئے وہ قصاب ہے۔ بادشاہوں میں اس کا کام نہیں۔ شعرا نے کہا کہ جس تصویر کے رنگ میں ہمارے قلم یا مصوران تصانیف کی تحریر نے رنگ بقانہ ڈالا ہو اُسے اس دربار میں نہ آنے دیں گے۔ اس بات پر اُس نے بھی تامل کیا اور متاسف معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت ہاتف نے آواز دی کہ اے چنگیز جس طرح ملک و شمشیر کے جوش کو قوم کے خون میں حرکت دی۔ اگر علوم و فنون کا بھی خیال کرتا تو آج قومی ہمدردی کی بدولت ایسی ناکامی نہ اُٹھاتا اتنے میں چند مورخ آگے بڑھے۔ انھوں نے کچھ ورق دکھائے کہ اُن میں توزہ چنگیز خانی یعنی اُس کے مُلکی انتظام کے قواعد لکھے تھے

آخر قرار پایا کہ اُسے دربار میں جگہ دو۔ مگر اُن کا غذوں پر کچھ لہو کے چھینٹے دو اور ایک سیاہی کا داغ لگا دو۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک جوان اسی شکوہ و شان کا اور آیا۔ اُس کا نام ہلاکو خاں تھا۔ اُس کے لیے چند علما سے نے بھی مورخوں کا ساتھ دیا۔ جس وقت اندر لائے تو اُس کے لیے بھی تکرار و کا غُل ہوا چاہتا تھا۔ مگر ایک مرد بزرگ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا۔ جس کی وضع تشرع عالموں کی تھی۔ لیکن کمر میں ایک طرف اُصطرلاب دوسری طرف کچھ اقلیدس کی شکلیں لٹکتی تھیں۔ بغل میں فلسفہ اور حکمت کے چند اجزا رتھے۔ اُن کا نام محقق طوسی تھا۔ چنانچہ انھیں دیکھکر کوئی بول نہ سکا۔ اسے تو بادشاہوں کی صف میں جگہ مل گئی۔ محقق کو شیخ بوعلی سینا نے یہ کہکر بٹھالیا کہ آپ نے میری کلاہ شہرت میں بقائے دوام کے آبدار موتی ٹانکے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ امیر تیمور کی نوبت آئی۔ بہت سے

لہ اس کے عہد میں علوم و فنون نے بڑی ترقی کی تھی۔ خصوصاً علم ہیئت کی کتابیں اور رصدِ مراغہ کی تعمیر اس کی شاہد حال ہے ۱۲

مورخوں نے اس کے لانے کی التجا کی مگر وہ سب کو دروازہ پر چھوڑ گیا۔ اور اپنا آپ رہبر ہوا۔ کیونکہ وہ خود مورخ تھا۔ رستہ جانتا تھا اور اپنا مقام پہچانتا تھا۔ لنگڑاتا ہوا گیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تیمور کرسی پر بیٹھتے ہی تلوار ٹیک کر اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ اے اہل تصنیف میں تم سے سوال کرتا ہوں کہ ہماری شمشیر کے عوض جو خدا نے تمھیں قلم تحریر دیا ہے اُسے اظہار واقعیت اور خلایق کی عبرت اور نصیحت کے لیے کام میں لانا چاہیے یا اغراض نفسانی اور بد زبانی میں؟ تمام مورخ ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے کہ یہ کس پر اشارہ ہے؟ اُس وقت تیمور نے **ابن عرب شاہ** کے بُلانے کو ایما فرمایا۔ معلوم ہوا کہ وہ کہیں پیچھے رہ گیا۔ چنانچہ اُس کا نام مصنفوں کی فہرست سے نکالا گیا۔

اسی حال میں دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ آزاد وضع قطع تعلق کا لباس بر میں۔ خاکساری کا عمامہ سر پر آہستہ آہستہ چلے آتے ہیں۔ تمام علما و صلحا۔ مورخ اور شاعر سر جھکائے ان کے ساتھ ہیں۔ وہ دروازہ پر آکر ٹھہرے۔ سب نے آگے بڑھنے کو التجا کی تو کہا معذور رکھو۔ میرا ایسے مقدموں میں کیا کام ہے۔ اور فی الحقیقت وہ معذور رکھے جاتے۔ اگر تمام اہل دربار کا شوق طلب اُن کے انکار پر غالب نہ آتا۔ وہ اندر آئے۔ ایک طلسمات کا شیشہ

مینائی اُن کے ہاتھ میں تھا کہ اُس میں کسی کو دودھ۔ کسی کو شربت۔
کسی کو شراب شیرازی نظر آتی تھی۔ ہر ایک کُرسی نشین انھیں اپنے
پاس بٹھانا چاہتا تھا۔ مگر وہ اپنی وضع کے خلاف سمجھکر کہیں نہ بیٹھے۔
فقط اس سرے سے اس سرے تک ایک گردش کی اور چلے گئے۔ وہ
حافظ شیراز تھے اور شیشۂ مینائی اُن کا دیوان تھا جو فلک
مینائی کے دامن سے دامن باندھے ہے۔ لوگ اور کرسی نشین کے
مشتاق تھے کہ دور سے دیکھا بے شمار لڑکوں کا غول غُل مچاتا چلا
آتا ہے۔ بیچ میں اُن کے ایک پیر مرد نورانی صورت جس کی سفید
داڑھی میں شگفتہ مزاجی نے کنگھی کی تھی اور خندہ جبینی نے ایک طرّہ
سر پہ آویزاں کیا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں گلدستہ دوسرے میں
ایک میوہ دار ٹہنی پھلوں پھولوں سے ہری بھری تھی۔ اگرچہ مختلف
فرقوں کے لوگ تھے جو باہر استقبال کو کھڑے تھے مگر انھیں دیکھکر
سب نے آگے قدم بڑھائے کیونکہ ایسا کون تھا جو **شیخ سعدی**
اور ان کی **گلستان۔ بوستاں** کو نہ جانتا تھا۔ انھوں نے
کمرہ کے اندر قدم رکھتے ہی **سعد زنگی** کو پوچھا۔ اُس بیچارے کو
ایسے درباروں میں بار بھی نہ تھی لیکن اور کُرسی نشین کہ اکثر اُن سے
واقف تھے۔ اور اکثر اشتیاق غائبانہ رکھتے تھے وہ اُن کے مشتاق

معلوم ہوئے باوجود اس کے یہ ہنسے اور اتنا کہکر اپنے لڑکوں کے لشکر میں
چلے گئے " دنیا دیکھنے کے لیے ہی برتنے کے لیے نہیں "

بعد اس کے دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک اولوالعزم شخص آیا
جس کے چہرہ سے خودسری کا رنگ چمکتا تھا اور سینہ زوری کا جوش
بازوؤں میں بل مارتا تھا۔ اُس کے آنے پر تکرار ہوئی اور مقدمہ یہ تھا کہ
اگر علما کی نہیں تو مورخوں کی کوئی خاص سند ضرور چاہیے ہے۔ بلکہ
چغتائی خاندان کے مورخ صاف اُس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے۔
اُس نے باوجود اس کے ایک کرسی پر جس پر تیموری تمغہ بھی لگا تھا
گھسیٹ لی اور بیٹھ گیا۔ **ہمایوں** اسے دیکھکر شرمایا اور سر جھکا لیا۔ مگر
پھر تاج شاہی پر انداز کج کلاہی کو بڑھا کر بیٹھا اور کہا کہ بے حق بے استقلال
ہے۔ اُس نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ مجھے اتنا فخر کافی ہے کہ میرے
دشمن کی اولاد میرے رستہ پر قدم بقدم چلیں گے اور فخر کریں گے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک خورشید کلاہ آیا جس کا چہرہ کشیدہ اور ہوائی
نورانی۔ ہندوستانیوں کے فرقہ ہائے مختلف کا جس لیے آتا تھا۔
جس وقت آیا تو تمام اہل دربار کی نگاہیں اُس کی طرف اُٹھیں۔ اور رضامندی
عام کی ہوا چلی۔ تعجب یہ ہے کہ اکثر مسلمان اُس کو مسلمان سمجھتے تھے۔ ہندو
اسے ہندو جانتے تھے۔ آتش پرستوں کو آتش پرست دکھائی دے رہا تھا

نصاریٰ اُس کو نصاریٰ سمجھتے تھے مگر اُس کے تاج پر تمام سنسکرت حروف لکھے تھے۔ اُس نے اپنے بعض ہم قوموں اور ہم مذہبوں کی شکایت کر کے **بداونی** پر خون کا دعوےٰ کیا کہ اُس نے میری حیات جاودانی کو خاک میں ملانا چاہا تھا اور وہ فتحیاب ہوتا اگرچہ منصف مصنفوں کے ساتھ **ابوالفضل** اور **فیضی** کی تصنیف میری مسیحائی نہ کرتی۔ سب نے کہا نیّت کا پھل ہے۔

اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا وہ خود مخمور نشہ میں چور تھا ایک عورت صاحب جمال اُس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا اُس کے نورِ جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اُسی کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا۔ اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھکر سب مسکرائے مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا اس لیے بدمست بھی نہ ہوتا تھا۔ جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ وہ **جہانگیر** تھا اور بیگم **نورجہاں** تھی۔

شاہجہاں بڑے جاہ و جلال سے آیا۔ بہت سے مورخ اس کے ساتھ کتابیں بغل میں لیے تھے۔ اور شاعر اس کے

آگے آگے قصیدے پڑھتے آتے تھے۔ ہر عمارت اُن عمارتوں کے فوٹو ہاتھ میں لیے تھے۔ جو اُس کے نام کے کتابے دکھاتی تھیں۔ اور سیکڑوں برس کی راہ تک اُس کا نام روشن دکھاتی تھیں۔ اس کے آنے پر رضامندئ عام کا غلغلہ بلند ہوا چاہتا تھا کہ ایک نوجوان آنکھوں سے اندھا چند بچّوں کو ساتھ لیے آیا کہ اپنی آنکھوں کا اور بچّوں کے خون کا دعوے کرتا تھا۔ یہ شہریار شاہجہاں کا چھوٹا بھائی تھا اور بچّے اس کے بھتیجے تھے۔ اس وقت وزیر اس کا آگے بڑھا اور کہا کہ جو کیا گیا بدنیتی اور خود غرضی سے نہیں کیا گیا بلکہ خدا کے امن اور ملک کا انتظام قایم رکھنے کو کیا۔ بہرحال اُسے دربار میں جگہ ملی اور سلاطین چغتائیہ کے سلسلہ میں معزز درجہ پر ممتاز ہوا۔

ایک تاجدار آیا کہ جبّہ اور عمامہ سے وضع زاہدانہ رکھتا تھا۔ ایک ہاتھ سے تسبیح پھیرتا جاتا تھا۔ مگر دوسرے ہاتھ میں جو فردِ حساب تھی اُس میں غرق تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کی میزان کو پڑتا لتا ہے سب نے دیکھکر کہا کہ اُنھیں خانقاہ میں لیجانا چاہیے۔ اس دربار میں اس کا کچھ کام نہیں۔ لیکن ایک ولائتی کہ بظاہر منقطّع اور معقول نظر آتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ اُٹھا کر آگے بڑھا اور کہا کہ اے ارا کینِ دربار ہمارے ظلِّ سبحانی نے اس کمبخت سلطنت کے لیے بھائی

سے لیکر باپ تک کا لحاظ نہ کیا۔ اس پر بھی تمھارے اعتراض اُسے اس دربار میں جگہ نہ دیں گے۔ یہ لطیفہ اُس نے اس مسخرے پن سے ادا کیا کہ سب مُسکرائے اور تجویز ہوئی کہ تیموری خاندان کے سب سے اخیر میں انھیں بھی جگہ دیدو۔ معلوم ہوا کہ وہ عالمگیر بادشاہ اور ساتھ اُس کے **نعمت خاں عالی** تھا۔

اس کے ساتھ ہی ایک بینڈا جوان دکھنی وضع جنگ کے ہتھیار لگائے راجگی کے سکّے ٹھٹھے سے سجا ہوا آیا۔ اُس کی طرف لوگ متوجہ نہ ہوئے بلکہ عالمگیر کچھ کہنا بھی چاہتا تھا مگر وہ کرسی کھینچکر اُس کے سامنے ہی بیٹھ گیا اور بولا کہ صاحب ہمّت کو جگہ دو یا نہ دو وہ آپ جگہ پیدا کرلیتا ہے۔ یہ **سیواجی** تھا جس سے مرہٹہ خاندان کی بنیاد قایم ہوئی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دور سے گانے بجانے کی آواز آئی اور بعد اس کے بادشاہ آیا۔ اس کی وضع ہندوستانی تھی۔ مغلیہ [illegible]خوں میں سے کوئی اس کے ساتھ نہ تھا البتہ چند اشخاص تھے لیکن ان میں گویا اور بھانڈ کوئی مسخرا نظر آتا تھا۔ یہ سب گھبرائے ہوئے آتے تھے کیونکہ ایک ولایتی دلاور اُن کے پیچھے پیچھے شمشیر برہنہ علم کیے تھا۔ اس کی اصفہانی تلوار سے لہو کی بوندیں ٹپکتی تھیں۔ مخمل

رومی کی کلاہ تھی جس پر ہندوستان کا تاج شاہی نصب تھا اور اسپ بخارائی زیر ران تھا۔ وہ ہندوستانی وضع بادشاہ **محمد شاہ** تھا۔ اُسے دیکھتے ہی سب نے کہا کہ نکالو۔ نکالو۔ ان کا یہاں کچھ کام نہیں۔ چنانچہ وہ فوراً دوسرے دروازے سے نکالے گئے۔ ولائتی مذکور **نادر شاہ** تھا۔ جس نے سرحد روم سے بخارا تک فتح کر کے تاج ہندوستان سر پہ رکھا تھا۔ اُسے چنگیز خاں کے پاس جگہ مل گئی۔

تھوڑی دیر ہوئی تھی جو ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوا۔ ان لوگوں میں بھی کوئی مرقع بغل میں دبائے تھا کوئی گلدستہ ہاتھ میں لیے تھا۔ اُنھیں دیکھ دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے۔ اور وجد کر کے اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ یہ ہندوستانی شاعر تھے۔ چنانچہ چند اشخاص منتخب ہوئے۔ ان میں ایک شخص کو دیکھا کہ جب بات کرتا تھا اُس کے منہ سے رنگا رنگ کے پھول جھڑتے تھے۔ لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلائے تھے۔ مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے۔ پھر بھی مشتاق زمین پر گرنے نہ دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی اُٹھا ہی لیتا تھا۔ وہ **مرزا رفیع سودا** تھے۔

میر بد دماغی اور بے پروائی سے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ شعر پڑھتے تھے اور منہ پھیر لیتے تھے۔ درد کی آواز دردناک دنیا کی بے بقائی سے جی بیزار کیے دیتی تھی۔ میر حسن اپنی سحر بیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے۔ میر انشاء اللہ خاں قدم قدم پر نیا بہروپ دکھاتے تھے۔ دم میں عالم ذی وقار متقی پرہیزگار۔ دم میں داڑھی چٹ بھنگ کا سونٹا کندھے پر۔

جرات کو اگرچہ کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا مگر وہ میٹھی آواز سے ایک تان اُڑاتا تھا تو سب کے سر ہل ہی جاتے تھے۔ ناسخ کی گلکاری چشم آشنا معلوم ہوتی تھی۔ اور اکثر جگہ قلم کاری اُس کی عینک کی محتاج تھی۔ مگر آتش کی آتش زبانی اُسے جلائے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔

مومن کم سخن تھے مگر جب کچھ کہتے تھے جرات کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔

ایک پیر مرد دیرینہ سال۔ محمد شاہی دربار کا لباس۔ جامہ پہنے کھڑکی دار پگڑی باندھے۔ جریب ٹیکتے آتے تھے۔ مگر ایک کھنڈر کے بانکے پیچھے پیچھے گالیاں دیتے تھے۔ بانکے صاحب صد وار اُن کے ... گریبان ہو جاتے مگر چار خاکسار اور پانچواں

تاجدار اُن کے ساتھ تھا۔ یہ بچا لیتے تھے۔ بُڈھے **میرامّن** دہلوی چار درویش کے مصنّف تھے اور بانکے صاحب **میر سرور** فسانہ عجائب والے تھے۔ **ذوق** کے آنے پر پسند عام کے عطر سے دربار مہک گیا۔ انھوں نے اندر آکر شاگردانہ طور پہ سب کو سلام کیا۔

سودا نے اُٹھکر ملک الشعرائی کا تاج اُن کے سر پر رکھدیا۔ **غالب** اگرچہ سب سے پیچھے تھے پر کسی سے پیچھے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقّارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا۔ مگر سب واہ واہ اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔

اب میں نے دیکھا کہ فقط ایک کرسی خالی ہے اور بس اتنے میں آواز آئی کہ **آزاد** کو بُلاؤ۔ ساتھ ہی آواز آئی کہ شاید وہ اس جگہ میں بیٹھنا قبول نہ کرے۔ مگر وہیں سے پھر کوئی بولا کہ اُسے جن لوگوں میں بٹھا دوگے بیٹھ جائے گا۔ اتنے میں چند اشخاص نے غل مچایا کہ اُس کے قلم نے ایک جہان سے لڑائی باندھ رکھی ہے اُسے دربار شہرت میں جگہ نہ دینی چاہیے۔ اس مقدمہ پر قیل و قال شروع ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ نقاب چہرہ سے اُلٹ کر آگے بڑھوں

اور کچھ بولوں کہ میرے ہادیِ ہمدم یعنی فرشتۂ رحمت نے ہاتھ پکڑ لیا اور چُپکے سے کہا کہ ابھی مصلحت نہیں۔ اتنے میں آنکھ کُھل گئی۔ میں اس جھگڑے کو بھی بھول گیا۔ اور خدا کا شکر کیا کہ بلا سے دربار میں کُرسی ملی یا نہ ملی۔ مُردوں سے زندوں میں تو آیا۔

(از نیرنگ خیال)



سوتاڑہ

(از مولوی محمد عزیز مرزا بی - اے - مرحوم)

بہارستان فطرت میں پہاڑوں کا ایک عجیب مرتبہ ہے - کیسا ہی معمولی منظر ہو - لیکن اگر وہ کسی اونچے پہاڑ پر منتہی ہوتا ہے تو اُس میں عجیب دلفریبی پیدا ہو جاتی ہے - دور سے سر سبز سر بہ فلک کشیدہ پہاڑ نظر آ کر مُردہ دلوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو شفّاف سیمیں چشمے اُن سے جا بجا اُچھلتے کودتے نکلتے ہیں - وہ اپنی مجموعی قوّت سے دریا بہاتے اور عالم کی سر سبزی و شادابی کا موجب ہوتے ہیں - یہی پہاڑ ہیں جن کا نظارہ انسان کو اپنے بے حقیقتی و بے بضاعتی کا دل ہی دل میں قائل کر کے کسی اور عالم میں پہنچا کر معرفت الٰہی کا سبق پڑھاتا ہے - اور انھیں پہاڑوں کی تاریک کھوؤں کی خوفناک تنہائی میں نفس امّارہ کا ستایا ہوا انسان گوشہ گزین ہو کر عبادت و ریاضت کی بدولت قید جسمانی سے آزاد ہو کر کسی اور ہستی کی سیر کرتا ہے - یہی پہاڑ ہیں جو ہزارہا سال سے بیش بہا جواہرات کو جگر گوشوں کی طرح سینہ میں چھپائے ہوئے چلے آتے ہیں - اور سختی مقابلہ سے انسان کی بہترین کوششوں کی بھی ہمّت شکن

اُن تک رسائی ہونے دیتے ہیں۔ انھیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر بکھرے ہوئے سنگ ریزے ایسے ایسے سمندروں اور دوردراز طوفانوں کی یاد دلاتے ہیں جن کے مقابلہ میں گویا طوفان نوح کل ہوا ہے۔ غرضکہ پہاڑ زمانہ قدیم کی جہاں تک کہ مورخوں کا ذہن بھی رسائی نہیں کرسکتا۔ زندہ تاریخ اور انسان کے لیے عجیب مایۂ دولت و عبرت ہیں۔

ضلع بیٹر کی خوش قسمتی ہے کہ مغربی گھاٹ کا شمالی حصّہ آدھے ضلع کو گھیرے ہوے ہے۔ اور گو ان پہاڑوں میں یہ بڑا نقص ہے کہ درختوں سے جو دراصل ان کا زیور ہے بالکل خالی ہیں اور اُن کا بالائی حصّہ کوسوں تک انسان وحیوان کی سکونت اور پرورش کے لیے پھیلتا ہوا چلا گیا ہے۔ اور صرف نظر کے قدم قدم چھوٹے اور بڑے گول اور نوک دار روڑوں سے ٹھوکر کھانے سے محسوس ہوتا ہے کہ بالائے کوہ ہیں۔ لیکن پھر بھی کہیں کہیں خصوصاً چڑھاؤ اور اُتار پر ایسے ایسے دلفریب سمے سامنے آجاتے ہیں جو بھولنے سے بھی نہیں بھلائے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ گرمیوں کے موسم میں ان کی سطح اور ڈراونی بلندی تھکے ماندے مسافروں کا دل دور سے نظر آکر بٹھا دیتی ہے لیکن کسی مقام پر جب قریب پہنچتے ہیں تو اُس کی کافی تلافی ہوجاتی ہے۔

بیڑ کے مغرب میں جس مقام پر گھاٹ ختم ہوتا ہے۔ وہاں کی زمین
عجب زرخیز ہے کوسوں تک جدھر نظر جاتی ہے ہرے بھرے
کھیتوں کی تازگی کحل الجواہر کا کام کرتی ہے۔ اور برسات کے موسم
میں خواہ حضرت میکائیل کیسی ہی جزو رسی فرمائیں مگر وہاں کی سیر
حاصل زمین محنت کے مارے کسانوں کو وقت پر مالا مال کردیتی
ہے۔ جوار کے درخت انسان کے قد سے ایک ہاتھ اونچے ہوتے
ہیں اور بڑے بڑے دانوں کی کثرت سے بالیں پھٹی پڑتی ہیں
اُن زرخیز کھیتوں کا سلسلہ ایک سیدھی ہموار سڑک پر ختم ہوتا ہے
جو بخط مستقیم گھاٹ سے اُترتے ہوئے گجرات کو جاتی ہے۔ یہ
کھیت اور یہ سڑک آفتاب کی تیز روشنی میں بالکل ایسے معلوم ہوتے
ہیں کہ گویا دھانی دوپٹہ پر روپہلا پٹھّہ لگا ہوا ہے اس سڑک کے دوسری
طرف گھاٹ کے کنارے کے نزدیک موضع سوتاڑہ اس طرح واقع
ہوا ہے کہ گویا کوئی عقاب قلعہ کوہ پر پر پھیلائے ہوئے بیٹھا ہے۔
اگرچہ مکانات اور باشندوں کی عام حالت اور استقلال کے
لحاظ سے مرہٹواری کے دوسرے دیہات کے مقابلہ میں سوتاڑہ میں
کوئی چیز مابہ الامتیاز نہیں ہے۔ لیکن اگر کوہ کے اطراف کی سرسبزی
وشادابی ٹھنڈی ہوائیں باشندوں کی فارغ البالی اور تواضع

اور سب سے زیادہ وہاں کا دلفریب منظر انسان کے دل پر عجب اثر ڈالتا ہے۔ موضع کی دوسری طرف بجانب مغرب نصف میل تک افتادہ زمین کا سلسلہ جو کہیں سے اونچی اور کہیں سے نیچی ہے۔ نشیب و فراز ہستی کا سبق پڑھاتا ہوا گھاٹ کے کنارے تک چلا گیا ہے۔ وہاں پہنچکر خدا کی قدرت کا تماشا نظر آتا ہے۔ اگر ذرا گردن جُھکا کر دیکھا جائے تو ایک عمیق غار نظر آتا ہے جس کے دونوں طرف سیدھی دیواریں کھڑی ہوی ہیں۔ یہ دونوں دیواریں ملکر زاویہ حادّہ بناتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی فوق الانسان قوت نے پہاڑ کا ایک مثلث نما ٹکڑہ جدا کر لیا ہے۔ عمق پانچ چھ سو فیٹ سے کم نہیں۔ اور چونکہ اُتار بالکل عمودی ہے اس لیے نظر کانپتی تھرتھراتی نیچے اُترتی ہے۔ مگر وہاں پہنچکر جو سماں سامنے آتا ہے وہ تمام خوف اور تمام زحمت کا کافی بلکہ کافی سے بھی زیادہ معاوضہ ہوتا ہے۔ چونکہ عرف عام میں اس غار کی گہرائی سونا ٹڑہ کے برابر سمجھی جاتی ہے اس لیے موضع کا نام سونا ٹڑہ رکھا گیا ہے۔

خوف زدہ نگاہ سطح تحتانی پر پہنچکر ہر طرف گھنے درخت دیکھتی ہیں جن کے گھنگھور پتّوں کی سیاہی مایل سبزی دل پر ایک خاص اثر پیدا کرتی ہے اور درختوں کے بیچ میں پتیوں کی سبز نقاب منہ پر ڈالے ہوئے ناہموار

پہاڑی سطح پر ایک بلوریں چشمہ بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ جہاں کہیں کے پتّے زیادہ گھنے نہیں ہیں یا درختوں کی شاخیں آپس میں گلے ملتی ہوئی یا ہوا کے جھونکے نقاب کو ذرا چہرے سے ہٹا دیتے ہیں۔ چشمہ کے شفاف پانی کو نورانی جھلک انسان کی اپنی ہستی کو بھلاکر کسی اور ہستی کو یاد دلاتی ہے۔ غور سے دیکھتے ہیں تو پانی میں کسی گنبد نما عمارت کا عکس پیچ و تاب کھاتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور جب سایہ سے اصل کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے تو ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے گھنے پتّوں کی گہری سبزی سے کوئی سفید سفید چیز جس نے منظر کو اور بھی دلربا بنا دیا ہے۔ جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جس مقام پر غار کا غیر بصورت زاویہ ختم ہوتا ہے وہاں کچھ اور ہی کیفیت ہے۔ ہر طرف سے چھوٹے چھوٹے چشمے بہتے چلے آتے ہیں اور غار کے قریب پہنچکر اُن کا منتشر پانی ایک تیز پہاڑی چشمے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جو شور مچاتا۔ اُچھلتا کودتا۔ مچلتا کنارہ تک پہنچتا ہے۔ اور وہاں اپنی سطح کو جس کی تلاش میں اسقدر سرگردان و پریشان ہونا پڑا ہی نہ پاکر بے قرار ہوتا ہے اور اُسی کرب و اضطراب کے عالم میں ایک چھلانگ ایسی مارتا ہے کہ مُنہ کے بل گرتا ہے۔ یہ تماشا دیکھکر انسان اسقدر محو ہو جاتا ہے کہ اس کا بے اختیار جی چاہتا ہے

کہ ذرا نیچے اُتر کر اسی بہار جاں فزا کا لطف اور بھی اچھی طرح اُٹھائیں۔
مگر پہلے یہ عمودی اتار دل بیٹھا دینے والی گہرائی اور اونچی اونچی ناہموار
سیڑھیاں اُس کے پاؤں پکڑ لیتی ہیں۔ مگر شوق اِسے اس زور سے
ڈھکیلتا ہے کہ بے اختیار اُس کے قدم حرکت میں آتے ہیں۔ اور
اُن اُنگڑھ سیڑھیوں کو جن کے بنانے میں دست صنعت کا
بہت ہی کم دخل ہے۔ جس طرح بنتا ہے طے کرتا ہوا ایک ایسے مقام
پر پہنچتا ہے جہاں کچھ دور پہلوان چٹان کے سوا کوئی اور شے نظر نہیں
آتی۔ مجبور بیٹھکر پھسلنے لگتا ہے اور جب تھوڑی دیر میں سیڑھیاں
نمودار ہو جاتی ہیں تو پھر پہلے کی طرح گرتا پڑتا آگے بڑھتا ہے۔ اور
خدا خدا کر کے کوئی آدھ گھنٹے سخت محنت میں جو اُس کو پسینے پسینے
کر دیتی ہے نیچے کی سطح پر قدم رکھتا ہے۔ مگر وہاں پہنچتے ہی ایسا ہوش ربا
سین دیکھتا ہے جو تمام کلفتوں کو آن کی آن میں بھلا دیتا ہے۔ دو طرف
سے سر بفلک کشیدہ سنگلاخ دیواریں نظر کو روکتی ہیں۔ جن پر جا بجا
کسی دیہاتی مگر ہمدرد انسان نقاش نے اپنے غیر تربیت یافتہ
ہاتھوں سے آدمی نما پتلوں کی انگڑھ تصویریں ناواقف اُترنے والوں
کی رہبری کے لیے بنا دی ہیں۔ جنوب کی طرف جہاں تک نظر
جاتی ہے کھیت ہی کھیت پھیلے ہوئے چلے گئے ہیں جن میں ایک

شفاف ندّی جس کا پاٹ فاصلہ کے ساتھ جاتا ہے بہ رہی ہی۔ شمال کی آبشار ریل کی طرح شور مچاتی ہوئی گر رہی ہی۔ مگر درختوں کے جھرمٹ کی وجہ سے نظر نہیں آتی۔ بیچ میں ایک بلوریں چشمہ اپنی پہاڑی ندی میں عجب مستانہ چال سے لڑکھڑاتا۔ قدم قدم پر گول اور نوکدار چوپہل چھوٹے اور بڑے سنگریزوں سے ٹکر کھاتا ہوا بہ رہا ہے اور ہر طرف بڑے بڑے درخت اُس کے سرد اور شفاف پانی کو آفتاب کی گرمی اور پہاڑی ہواؤں کے تُند جھونکوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ہر طرف چھتریاں لگائے کھڑے ہیں۔ جن میں سے چھن چھن کر آفتاب کی زرد کرنیں سطح آب پر گرتی اور مہتاب کے چھوٹنے کا سماں دکھاتی ہیں۔ چشمہ کے اُدھر پتّوں میں چھپی ہوئی وہی عمارت جس کا عکس اوپر سے آیا تھا دکھائی دیتی ہے اور جب چشمہ کو عبور کرکے دوسری طرف پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بلند کرسی پر ایک چھوٹا سا مندر ہی جو کسی فطرت پرست رشی نے اس ہوش ربا مقام میں جہاں ہر شے صانع حقیقی کی لاجواب صنعت کا پتہ دے رہی ہے۔ اطمینان قلب سے صحیفہ فطرت کی ورق گردانی میں مصروف رہکر راز ہستی کے حل کرنے کی نیت سے بنایا ہے۔ اس دلربا مندر کی سیر اور اُس کے پانی کے لاجواب انتخاب پر داد دے کر انسان درختوں کے سایہ میں

چشمے کے کنارے کنارے اُس کی دل لبھانے والی خوش فعلیوں کا نظارہ کرتے ہوئے شمال کی طرف بڑھتا ہے اور جونہی کہ درختوں کے جھنڈ سے سر نکالتا ہے ایک عجب جانفزا منظر کے سامنے آجاتا ہے شور ایسا ہی کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی - مگر معلوم یہ ہوتا ہی کہ ایک دریا اُمڈا چلا آتا ہے جس سے نظر کو حیرت کے ساتھ تسکین بھی ہو جاتی ہے - جب عالم محویت میں قدم بڑھاتا اور بھی قریب ہوتا اور نظر اُٹھا کر دیکھتا ہے تو پہلے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بلّور کی چادر ہوا میں لٹکی ہوئی ہے مگر کسی قدر نیچے آکر اُس چادر کے ٹکڑے ہو کر کئی دھاریں بن جاتی ہیں اور تھوڑی دور تک یہی کیفیت رہتی ہے - پھر ہر چھوٹی دھار بڑی بوندوں کی شکل میں منتقل ہوتی ہے جن کی جسامت فاصلہ کے ساتھ گھٹتی جاتی ہے - یہاں تک کہ نیچے پہنچتی ہیں تو چھوٹے ہوتے ہوتے جزو لایتجزٰی کا ثبوت دیتی ہوئی دھوئیں کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں - لیکن یہاں کی خاک بھی اکسیر کا حکم رکھتی ہی کہ یہ موہوم اجزا ارمائی سطح تحتانی سے ملحق ہوتے ہی پھر ایک زوردار چشمہ بنجاتے ہیں - یہ نظارہ اس قدر دلفریب ہے کہ انسان گھنٹوں تک عالم محویت میں نظر جمائے کھڑا رہتا ہے - پھر دفعتاً خیال آتا ہے کہ شام ہوئی جاتی ہے واپس چلنا چاہیے مگر شوق کے تقاضے

اور ہمّت دلانے سے یہاں تک تو پہنچا دیا تھا لیکن اب واپسی کا رے دارد - بہرحال جس طرح بھی ممکن ہے بادل ناخواستہ گرتا پڑتا بیٹھتا اُٹھتا جا بجا پانی سے حلق کو تر کرتا ہوا اوپر پہنچتا ہے اور تھک تھکا کر بدن تختہ سا ہو جاتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ

ع خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا -

(انتخاب رسالہ مخزن)



مہمان و میزبان

(از مولوی مشتاق حسین صاحب وقار الملک بہادر)

مہمانی اور میزبانی کی خوبیاں اور برکتیں ایسی صریح اور صاف ہیں کہ اُن کے بیان کی کچھ حاجت نہیں ہے - آپس میں محبت اور ارتباط بڑھانے کے واسطے یہ رسم بہت ہی موثر ثابت ہوئی ہے - اس رسم سے غیر بھی اپنے ہو جاتے ہیں بلکہ دشمن بھی دوست بن جاتے ہیں اور اُسی کے جاری نہ رہنے سے قریب تر عزیزوں کی قدرتی محبت میں بھی کمی آ جاتی ہے - پس جو شے اسقدر مفید ہو مناسب

ہو کہ وہ ہر ایک قسم کے نقصانات اور خرابیوں سے پاک وصاف رہے ورنہ اُس کے تمام فائدے برباد ہوجاویں گے۔ لیکن جس طریقے پر اس عرصہ میں ہم لوگوں میں مہمانی اور میزبانی ہوتی ہے وہ کچھ مفید نہیں ہے بلکہ اعتراض کے قابل ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ موجودہ رسم و رواج کے سبب سے اکثر اوقات مہمان اور میزبان دونوں کو تکلیف ہوتی ہے اس لیے ضرور ہے کہ مسلمان موجودہ طریقہ مہمانی اور میزبانی پر غور کریں اور جسقدر اصلاح اس میں ضروری ہو وہ عمل میں لاویں۔

اب ہم اُن خرابیوں کا بیان کرتے ہیں جو قابل اعتراض ہیں سب سے بڑی غلطی جو اکثر مہمانوں کی طرف سے ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے میزبان کو پہلے سے اپنے آنے کی خبر نہیں کرتے حالانکہ اس بے خبر وارد ہونے سے میزبان کو بڑی تکلیف ہوتی ہے اور خود مہمان کو بھی تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے علاوہ اس کے اس طرح پر بے خبر کسی کے مکان پر بطور مہمان کے وارد ہونا خلاف تہذیب بھی ہے۔

اکثر یہ ہوتا ہے کہ گھر والے کھانے سے فارغ ہوجاتے ہیں اُس کے بعد مہمانوں کی آمد ہوتی ہے اور اُس وقت ایک تازہ

تشویش پیش آتی ہے اِدھر تو کھانے کا سرانجام نہیں ہوتا اور اُدھر یہ خیال ہوتا ہے کہ مہمانوں کے واسطے کھانے میں دیر نہ ہو۔ نوکر چاکر جن کو دوبارہ پھر چولھا جھونکنا پڑتا ہے جُدا دل میں ناخوش ہوتے ہیں اور اگر کبھی رات کو ناوقت یہ مہمان داری پیش آگئی تو اور زیادہ مصیبت آتی ہے اور یہ آفت خاص کر اُن مقامات میں زیادہ آتی ہے جو ریل کے اسٹیشنوں سے قریب ہیں اب یہ ہوتا ہے کہ رات کے گیارہ یا بارہ بج گئے ہیں یا رات ڈھل گئی ہے اور پچھلا پہرہ ہے سب لوگ اپنے آرام کی نیندیں لے رہے ہیں کہ یکایک دروازہ پر سے آوازیں آنی شروع ہوئیں (کواڑ کھولو کواڑ کھولو) پھر بعض سونے والے ایسے غافل سوتے ہیں کہ مشکل سے جاگتے ہیں یا دروازہ سے بہت فاصلہ سے ہوتے ہیں یا جاڑوں کے موسم میں مکانوں کے اندر کواڑ بند کر کے سوتے ہیں ایسی صورت میں بے خبر آنے والے مہمان کو گھڑیاں پکارتے پکارتے اور چلّاتے چلّاتے اور کواڑ کھٹکھٹاتے اور زنجیریں ہلاتے گذر جاتے ہیں اور جب ان تمام مشکلات کے بعد کواڑ کھلے اور صاحب خانہ کو بھی بڑی بے لطفی اور تکلیف کے ساتھ جگایا گیا تو اب خیال کر لینا چاہیے کہ اُس غریب پر اُس وقت کیا گذری ہوگی۔ پھر کبھی یہ ہوتا ہے کہ مکان مختصر ہے یا اُس میں پہلے سے اور مہمان فروکش ہیں

اور مکان میں زیادہ جگہ نہیں ہے یا صاحب خانہ کسی ایسی تشویش میں ہے کہ اُس کو اپنے مہمانوں سے باطمینان وخوشی ملنے کی فرصت نہیں ہے ان تمام باتوں کے لحاظ سے ضرور ہے کہ اپنے آنے سے قبل اپنے میزبان کو حتی الامکان اطلاع دی جاوے اور نہایت صفائی قلب اور دوستی کی بات یہ ہے کہ اگر کسی وقت میزبان یہ اطلاع دے کہ مجھکو ملنے کی فرصت نہیں ہے تو بغیر کسی ملال خاطر کے اپنے ارادہ کو ملتوی کرنا چاہیے میں نے بعض اوقات یہ بھی دیکھا ہے کہ ایسے میزبان نے اپنی تکلیف بچانے کے واسطے یا مہمان کے آرام کی نظر سے مہمان کو کسی اور مکان میں اُتارا تو مہمان نے دل میں بہت ہی بُرا مانا حالانکہ میزبان کا یہ برتاؤ کسی طرح اعتراض کے لایق نہیں ہوتا بلکہ بڑی عمدہ بات خیال کی جاتی ہے۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہوگا کہ جن خرابیوں کا ذکر اس مضمون میں ہے وہ صرف اُس حالت سے متعلق ہیں جبکہ مہمان اور میزبان میں باہم نہایت دوستی نہ ہو مگر یہ خیال غلط ہے اس لیے کہ یہ ایسے امور ہیں جو بطور واقعات کے پیش آتے ہیں جن میں زیادہ دوستی ہونے یا نہونے کو کچھ مداخلت نہیں ہے۔

کبھی اس بے خبر آنے کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اصل مقصود وقت

ہوجاتا ہے جس سے ملنا مقصود ہوتا ہے وہ مکان پر نہیں ملتا اور زیادہ افسوس اُس وقت ہوتا ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی یا ابھی آپ کے تشریف لانے سے تھوڑی ہی دیر بعد وہ فلاں مقام کو سوار ہو گئے اور تب حسرت کے ساتھ وہاں سے لوٹ جانا ہوتا ہے اور یہ ایک کافی سزا اپنے بلا اطلاع آنے کی اُس وقت آنے والے کو مل جاتی ہے۔

اس بے خبر آنے کے علاوہ چند اور خرابیاں بھی بیان کے لائق ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ بعض میزبانوں کے مزاج میں تکلف اسقدر ہوتا ہے کہ اُن کا مہمان بھی تنگ آجاتا ہے ان تکلّفات کی وجہ سے کھانا اکثر دیر میں ملتا ہے اور تکلیف ہوتی ہے اور میزبان کو بھی زیادہ عرصہ تک اپنے عزیز مہمان کا قیام ناگوار معلوم ہونے لگتا ہے اور اُس کے آنے کی وہ ساری خوشی اُس کی موجودگی ہی میں جاتی رہتی ہے۔

سعدی علیہ الرحمۃ کسی مقام پر اپنے ایک دوست کے ہاں مہمان ہوئے اُن کے دوست نے بہت اہتمام سے اُن کی مہمانداری کی بہت تکلّف کے کھانے پکوائے اور بڑی شان کے ساتھ دسترخوان چُنا گیا۔ شیخ نے جب یہ سامان دیکھے تو بے اختیار اُس کی زبان سے

یہ نکلا۔ ہائے دعوتِ شیراز۔ صاحب خانہ نے یہ سمجھا کہ دعوت
کے اہتمام میں کچھ کمی رہی اس لیے اُس نے دوسرے تیسرے
وقت میں پیش از پیش اہتمام کیا لیکن ہر مرتبہ شیخ نے وہی افسوس
ظاہر کیا آخر جب شیخ نے دیکھا کہ اب میزبان کو بہت تکلیف ہوتی ہے
تو اُس نے اپنی اقامت کو مختصر کیا اور میزبان سے رخصت ہوا۔ کچھ عرصہ بعد
اُن کے اس میزبان کا گذر شیراز میں ہوا اور شیخ کے ہاں اُترا
اور دل میں اس بات سے بہت خوش تھا کہ اب شیراز کی دعوتوں
کے اہتمام دیکھنے میں آویں گے جب کھانے کا وقت آیا تو شیخ گھر
میں گیا اور وہاں سے وہی روزمرّہ کا سیدھا سادھا کھانا لے آیا
اور اپنے دوست کے سامنے رکھد یا اور کہا کہ بسم اللہ کیجیے۔ اُس وقت
شیخ کے دوست کو بہت ہی حیرت ہوئی اور اُس نے آہستہ
آہستہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کھانا شروع کر دیا۔ شیخ نے
اُس کی حیرت کو دیکھ کر کھانا کھا چکنے بعد اُس سے کہا کہ اے دوست
دعوتِ شیراز سے میرا یہی مطلب تھا۔ تم نے میرے واسطے
بہت سا تکلّف کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر میں زیادہ قیام کرتا تو تمکو
سخت ناگوار گذرتا اور میری مہمانی خوشی کی جگہ ملال سے مبدّل
ہو جاتی اسی لیے میں نے اُس وقت مجبور ہو کر اپنی مدّت

اقامت کو مختصر کیا اور جس غرض سے میں وہاں گیا تھا وہ بھی پوری نہ ہوئی نہ میں اچھی طرح وہاں ٹھہر سکا نہ سیر کر سکا اور جلدی سے رخصت ہوا یہاں اب آپ جس قدر مدت تک چاہیں قیام کریں جتنے روز آپ رہیں گے میری خوشی بڑھتی جاوے گی۔

میرا مطلب اس حکایت سے یہ نہیں ہے کہ اپنے دوستوں کی مہمانی کے زمانہ میں اُن کی خوشی خاطر کے لیے مطلق توجہ نہ کی جاوے نہیں بلکہ میرا یہ مطلب ہے کہ جو کچھ کیا جائے ایسے اعتدال سے کیا جاوے جو آیندہ بنھ سکے اور مہمان کے قیام سے سوائے خوشی کے دوسری بات حاصل نہ ہو۔

ان تکلفات کے علاوہ ایک اور اہتمام بھی جو اکثر عمل میں آتا ہے مہمان اور میزبان دونوں کے لیے سخت تکلیف کا باعث ہوتا ہے اور وہ مہمان اور میزبان کا ساتھ کھانا کھانے پر اصرار کرنا ہے اگر اتفاق سے اُن میں سے کوئی باہر کو چلا گیا اور آنے میں دیر ہوئی تو دوسرے صاحب اُن کے منتظر رہتے ہیں اور کھانا نہیں کھاتے اور جب زیادہ دیر ہوتی ہے تو جی میں نہایت تنگ ہوتے ہیں۔ تلاش کے واسطے چاروں طرف کو آدمی دوڑائے جاتے ہیں اور جب بڑی سی دیر کے بعد دوسرے صاحب آئے تب کھانا

نصیب ہوتا ہے اگر اتفاق سے کسی صاحب خانہ نے بلا انتظار اپنے مہمان کے کھانا کھا لیا اور مہمان صاحب بعد کو آئے تو بہت کم مہمان اس مزاج کے ہوتے ہیں جو میزبان کے اس برتاؤ سے بُرا نہ مان جاتے ہوں۔ میں نے خود ایک دفعہ دیکھا ہے کہ ایک مہمان جو باہر کو گئے ہوے تھے جب وہ ایک بجے تک بھی نہ آئے اور صاحب خانہ نے ظہر کی نماز بھی پڑھ لی تب مجبور ہو کر بلا انتظار مہمان کے کھانا کھا لیا اُس کے بعد مہمان صاحب سیر کر کے بھوکے پیاسے واپس تشریف لائے اور تھک کر بیٹھ گئے اور فرمانے لگے کہ آج تو مر مٹے جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ بھوک بھی اُن کو لگی ہوئی ہے اور بُشرے سے بھی ایسا ہی ظاہر ہوتا تھا لیکن جب اُنھوں نے یہ سُنا کہ صاحب خانہ نے کھانا کھانے میں میرا انتظار نہیں کیا تو نہایت ہی بُرا مانا یہاں تک کہ کھانا بھی نہ کھایا اور یہ عذر کر دیا کہ میں بھی کھانا کھا چکا ایک دوست مل گئے تھے اُنھوں نے بغیر کھانا کھلائے نہ اُٹھنے دیا۔ اب غور کرنا چاہیے کہ ان حماقتوں کا کیا نتیجہ ہوگا کیا اس مہمانی اور اس میزبانی سے کچھ محبّت اور خوشی بڑھ سکتی ہے۔

ایک اور خراب طریقہ یہ ہے کہ مہمان کو کوئی موقعہ تخلیہ اور آرام کا نہیں ملتا اور یہ خرابی دو وجہ سے پیدا ہوتی ہے اول اس لیے کہ ہمارے

مکانات کا طرز خراب ہوتا ہے۔ دوم ملنے جلنے کا طرز بھی اچھا نہیں
ہے۔ ہمارے مکانات اس طرح پر علحدہ علحدہ حصّوں میں تقسیم نہیں
ہوتے کہ ہر ایک شخص کے لیے بغیر اس کے کہ اوروں کو تکلیف ہو آرام
کے ساتھ تخلیہ ممکن ہو ایک ہی کھلا ہوا مکان ہوتا ہے وہی اپنے بیٹھنے
اُٹھنے کا وہی مہمانوں کے قیام کا۔ اگر کوئی بیمار ہے تو اُسی مکان میں
ہی۔ چبوترہ کے نیچے نال بھپکا بھی اُسی کے سامنے چڑھا ہوا ہے۔
ایک طرف کو ملّاں لڑکے بھی اُسی مکان میں پڑھا رہے ہیں وغیرہ
وغیرہ۔ اور اس لیے صاحب خانہ مجبور ہوتا ہے اور اپنے مہمان کے لیے
کوئی موقعہ تخلیہ کا آسانی سے موجود نہیں کر سکتا۔ اس خرابی کا دور
کرنا بالفعل غربا اور متوسط الحال شخصوں کے اختیار سے باہر ہے لیکن
اُمراء کو اس طرف توجہ کرنا ضرور ہے چنانچہ بعض امراء اپنے نو تعمیر
مکانوں میں اس قسم کی رعائتیں اب ملحوظ رکھتے ہیں یا اُن کے متعدد
مکانات ہوتے ہیں جن کی وجہ سے یہ دقّتیں اُن کو کمتر پیش آتی
ہیں لیکن اکثر امراء کو اب تک بھی اس طرف توجہ نہیں ہے اور اُن کی
پچاس پچاس ہزار اور ایک ایک لاکھ روپیہ کی عمارتیں اب تک بھی
اکثر اُسی پُرانے نقشہ پر بنائی جاتی ہیں جن میں نہ سردی کا آرام نہ گرمی
کا نہ مہمان کے لیے کوئی تخلیہ ممکن نہ اپنے لیے پس اگر امراء اس طرف

توجہ کریں تو آخر کار متوسط الحال شرفا بھی اُن کی پیروی کریں اور رفتہ رفتہ غربا بھی حتی الامکان اُنھیں کی تقلید کرنے میں ساعی ہوں۔

ایک اور تکلیف مہمان اور میزبان کے طرز ملاقات سے پیدا ہوتی ہے جس وقت مہمان کسی اپنے دوست یا عزیز و قریب کے مکان پر وارد ہوا صاحب خانہ اور اُس کے اور عزیز و اقارب اور دوست و آشنا سب اُس مہمان غریب کے گرد ہوئے اور گھڑیوں اور گھنٹوں بلکہ پہروں اُس کے پاس بیٹھنا شروع کیا ایک صاحب اُٹھکر تشریف لے گئے تو دو صاحب اور موجود ہوئے غرض ہر وقت یہ جلسہ اُس کے پاس رہنے لگا اب جتنا کوئی مہمان کسی کو عزیز ہو اُسی قدر یہ اہتمام زیادہ ہوتا ہے اور زیادہ عزیز کی مٹی زیادہ خوار ہوتی ہے۔ بہت ہی کم ہم سے وال ایسے بے تکلف مہمان ہوتے ہیں جو اس جم غفیر کا کچھ ادب اور لحاظ نہیں کرتے اور اپنے آرام میں خلل نہیں ڈالتے اور میزبان بھی ایسے بہت کم ہیں جو اپنے مہمان کی تکان راہ اور صعوبات سفر کے لحاظ سے اُس کے آرام و آسایش کا خیال کرتے ہوں اور بخوشی خاطر اُن کو ایسا موقع دیتے ہوں کہ جب تک وہ چاہیں آرام کریں اور خط و کتابت وغیرہ کا جو کچھ شغل وہ چاہیں

تخلیہ میں اطمینان کے ساتھ کر سکیں۔ ایک اور بڑی مشکل یہ ہے کہ مہمان بھی چونکہ ہماری ہی جنس سے ہوتے ہیں اور اسی قسم کے تپاک اور طرز ملاقات کے عادی ہوتے ہیں اس لیے ایسا بھی اکثر ہوتا ہے کہ اگر کوئی میزبان یا میزبان کا کوئی عزیز و قریب اپنے مہمان کے پاس زیادہ حاضر نہ رہے تو مہمان صاحب بھی بُرا مان جاتے ہیں اور حماقت سے یہ سمجھکر کہ ہماری کچھ قدر و منزلت نہ ہوئی خدا اپنی نظروں میں حقیر اور تھوڑے ہونے لگتے ہیں اس لیے صاحب خانہ اپنے مہمان کے سر پر ہر وقت ایک باک باک کرنے والا پہرہ متعیّن کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ یہ کیسی کچھ دقّت اور تکلیف کی بات ہے اور چونکہ ہم خواہ بہ حیثیت مہمان اور خواہ بہ حیثیت میزبان اس قسم کی تکلیفیں جھیلنے کے عادی ہو رہے ہیں اور اپنے بیش بہا وقت کو رائگاں کھونے میں نہایت مشاق ہیں اس لیے یہ برتاؤ ہمکو کچھ زیادہ ناگوار نہیں گذرتا ورنہ وہ شخص جو اپنے وقت کی کچھ بھی حفاظت کرتا ہو ایک دن کے واسطے بھی کبھی کسی کے ہاں اس طرح مہمان ہوکر یا کسی ایسے ناشناس کا میزبان ہوکر خوش نہیں رہ سکتا۔

مہمانی اور میزبانی کی ان تمام مذکورہ بالا مصیبتوں کے علاوہ اور بہت سی ایسی ہی بیہودہ باتیں ہیں جو ہم لوگوں میں رائج ہیں اور جن کے بیان

کرنے کے واسطے ایک مستقل رسالہ مرتب ہونا چاہیے اس لئے ہیں اُن کی طول طویل تفصیلوں میں پڑنا ضروری نہیں سمجھتا اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر وہ بڑی بڑی خرابیاں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا رفع ہوجاویں تو اور چھوٹی چھوٹی خرابیاں بھی جو اُنھیں بڑی خرابیوں سے پیدا ہوتی ہیں خود بخود رفع ہوجاویں گی لیکن ختم مضمون پر اُس تازہ مصیبت کا تذکرہ البتہ مناسب ہی جو مہمان کو رخصت کے وقت فرمان واجب الاذعان آمدن بہ ارادت ورفتن بہ اجازت سے پیش آتی ہے۔

مہمان نے اب ڈرتے ڈرتے اور نگاہیں نیچی کرکے صاحب خانہ سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی مگر صاحب خانہ نے صاف انکار کیا۔ مہمان ہرچند منت کرتا ہے اور اپنی سخت سخت ضرورتیں بیان کرتا ہے لیکن صاحب خانہ راضی نہیں ہوتے اُس مجلس میں اور جسقدر صاحب موجود ہوتے ہیں وہ بھی اپنا فرض یہی سمجھتے ہیں کہ صاحب خانہ کی تائید کریں وہ بھی مہمان کو قیام کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور اُس بےکسی کے گھنٹے میں ایک متنفس بھی ایسا دکھلائی نہیں دیتا جو خدا لگتی ہوئی کہے اور مہمان کی بےکسی پر بھی رحم کرے کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ ابھی آپ کہاں جاویں گے کوئی فرماتے ہیں کہ خاں صاحب کا کہنا نیچے نہ ڈالیے خاں صاحب حرف رخصت سے جدا تیوری چڑھائے ہوئے فرماتے ہیں کہ کبھی نہ کبھی تو آپ تشریف

لائے اور آتے ہی جانے کی سُنائی آپ کے اس آنے سے نہ آنا بہتر تھا دنیا کے کام چلے ہی جاتے ہیں یہاں آپ کب کب آتے ہیں۔ المختصر یہاں تک اُس مہمان کو تنگ کیا جاتا ہے کہ وہ سخت رنج میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے دل میں کہتا ہے کہ الٰہی میں کس عذاب میں آ گیا اور کیونکر اس سے نجات ہو گی اور اپنے آنے پر نہایت افسوس کرتا ہے اور قہر درویش بر جان درویش ایک دو مقام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پھر کیا یہ قیام فریقین میں کچھ محبت اور خوشی کو بڑھا سکتا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں بڑھا سکتا بلکہ برعکس اُس کے دلوں کو رنجیدہ کر دیتا ہے۔

اگر کوئی سخت بے حیا مہمان ہوا اور اُس نے نالائقی سے اپنے شفیق میزبان کے اصرار پر کچھ خیال نہ کیا اور سمجھانے والوں کی بات بھی نہ مانی اور چلنے کا مصمم ارادہ کر لیا تو اب یہ جنجال کسی طرح اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتا کہ کھانا کھا کر جانا ہو گا اور یہ اصرار خاص کر اُن مقامات میں مہمانوں کو مصیبت میں مبتلا کرتا ہے جہاں ریل کے اسٹیشن قریب ہیں اور مسافروں کو ریل کے ذریعہ سے سفر منظور ہوتا ہے اکثر یہ ہوتا ہے کہ اثنار سفر میں کوئی دوست اپنے دوست سے ملنے کے واسطے جو کسی اسٹیشن سے قریب ہوتا ہے اُترا اور یہ ارادہ کر لیا کہ دوسرے وقت کی ریل میں چلا جاؤں گا ایسے مسافروں سے بھی جب وہی معمولی تکلّف آمیز جھگڑے اور قصّے پیش آتے ہیں تو

اُن کو سخت حیرانی ہوتی ہے۔

اُدھر ریل کے وقت میں صرف ایک گھنٹہ یا ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے یہاں صاحب خانہ کے ہاں نوکر بازار سے گوشت لیکر بھی نہیں لوٹا مہمان کہتا ہے کہ برائے خدا مجھ کو رخصت کیجیے لیکن صاحب خانہ اس میں اپنی نہایت ذلت سمجھتے ہیں کہ بغیر کھانا کھائے یا کھانا ساتھ لیے مہمان گھر سے رخصت ہو اب نوکر بھی بازار سے آگیا اور ریل کا وقت بھی بہت نزدیک پہنچا اور مہمان پر ایک سخت اضطراب کی حالت طاری ہوئی کبھی وہ اپنے اس خوف کو کہ ریل چلی جاوے گی اور میں رہ جاؤں گا شرم سے ضبط کر کے چپکا ہو رہا اور کچھ دیر کے بعد گھبرایا اور کئی دفعہ چلنے کے قصد سے اُٹھنا چاہا مگر صاحب خانہ نے نہ اُٹھنے دیا آخر جب وقت بہت ہی نزدیک آگیا اور صاحب خانہ کو بھی کچھ ندامت سی ہوئی تو وہ بھی جلدی سے اُٹھے نوکر بازار کو پھر بھاگا کچھ مٹھائی بازار سے آئی کچھ آدھا کچا آدھا پکا کھانا میزبان صاحب گھر میں سے لائے اور بہزار سرعت و شتابی مہمان نے دس پانچ لقمے کھائے اور تھوڑا سا کھا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ میزبان صاحب اب بھی مصر ہوے کہ آپ نے کچھ نہ کھایا اور کھائیے غرض جس طرح سے ہوا وہ کمبخت مہمان صاحب خانہ سے رخصت ہوا سڑک پر دوڑ کر خدمتگار نے پان دیا اب مہمان صاحب بھاگم بھاگ اسٹیشن کو چلے راستہ میں ریل کی آواز سُنائی دی اور

بھی اوسان خطا ہوئے گاڑی والے سے تقاضا ہوا کہ جلدی چلو اور کچھ دور پہنچکر انعام کا بھی وعدہ کیا گیا اس نے بھی بے تحاشہ گاڑی دوڑائی اور ریل چھوٹنے سے پہلے اسٹیشن پر پہنچا دیا اور کرایہ اور انعام لیکر علحدہ ہوا اسٹیشن کے مزدور چلائے کہ پہلی گھنٹی ہو چکی ہے جلدی چلو ٹکٹ گھر میں پہنچکر جلدی سے ٹکٹ لیا اتنے میں دوسری گھنٹی بھی ہوئی میاں اور مزدور دوڑے جب ہی اسٹیشن کے اندر کے چبوترہ پر آئے تیسری گھنٹی ہوئی سیٹی بجی اور ریل نے آہستہ آہستہ آگے کو بڑھنا شروع کیا اب مہمان کمبخت حیران کھڑا ہے اور حسرت کے ساتھ ٹرین کی اس نرم نرم رفتار کو دیکھ رہا ہے اسباب والے مزدوروں نے سمجھایا کہ میاں آپ ہی نے دیر کر دی جانا تھا تو گھڑی بھر پہلے سے آئے ہوتے اب چلو دوسرے وقت کی ریل پر جانا یہ سُنکر مہمان غریب لوٹا اور پھر گاڑی کرایہ کرکے میزبان صاحب کے مکان پر آیا۔ راستہ میں سو سو طرح کے غمگین خیالات نے اس کو رنجیدہ کیا جب مہمان صاحب مکان پر آئے تو میزبان صاحب دور سے دیکھتے ہی بے اختیار ہنس پڑے اور فرمانے لگے کہ کہیے ریل پر ہو آئے آپ نے تو کمال کر دیا تھوڑی ہی دیر میں پہنچ بھی گئے اور چلے بھی آئے ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ آج نہ جاؤ ہمارا کہنا نہ مانا یہ اس کی سزا ہے۔

اب ہم اپنے ابنائے جنس سے اس طریق مہمانی اور میزبانی پر انصاف

چاہتے ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ آیا یہ طریقہ تبدیل اور ترمیم کے لائق ہے یا نہیں کیا ایسے برتاؤ کی حالت میں کوئی مہمان خوشی سے کسی اپنے دوست کے پاس آنے کا ارادہ کریگا - یہ کون سی آدمیت ہے کہ اپنے عزیز مہمان کی تمام ضرورتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کر قیام پر جاہلانہ اصرار کیا جاوے ایسی مصیبت کی حالت میں سفر کرنے والوں کو انواع و اقسام کی تکلیف ہوتی ہے وہ اپنے کوچ و مقام کا کوئی انتظام اپنے اختیار سے نہیں کر سکتے نہ اپنے وقتوں کی تقسیم پر قادر ہو سکتے ہیں اور اس کے علاوہ بہت سے ہرج اور نقصان جو اس قسم کی مزاحمت سے پیدا ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں اُن کی وجہ سے بجائے ملاقاتوں کی خوشی کے ایک قسم کا ملال اور رنج پیدا ہو جاتا ہے پس ہماری خواہش یہ ہے کہ ہمارے اس مضمون کے پڑھنے والے ہمارے اس مضمون پر انصاف سے غور کریں اور جو رسم و رواج اصلاح کے قابل ہیں اُس میں مناسب اصلاح کریں تاکہ مہمانی اور میزبانی کی خوشیاں اور زیادہ ہوں اور مہمان یا میزبان کسی کو تکلیف نہو اور وہ اصلاحیں جیسا ہم نے اوپر مفصل بیان کیا ہے مفصلہ ذیل مراتب میں ہونا چاہیے -

اول - حتی الامکان بلا اطلاع کسی کے ہاں آنے سے احتراز کرنا چاہیے گو باہم کیسی ہی بے تکلفی اور یگانگت ہو جہاں تک ممکن ہو اس قدر پہلے اطلاع دی جاوے

کہ جواب بھی آسکے ورنہ کم سے کم ایک دن پہلے میزبان کو اطلاع ہوجاوے اگر بدرجہ مجبوری یہ بھی نہ ہوسکے تو رات کے وقت حتی الوسع کسی کے مکان میں پہنچنے سے کنارہ کیا جاوے مگر جب ایسی کوئی سخت ضرورت پیش آجاوے۔

دوم - دعوت میں اس قدر تکلف نہ کرنا چاہیے جس سے اپنے عزیز مہمان کا قیام آخر کار ناگوار معلوم ہونے لگے بیچ بیچ کی چال ہمیشہ بہتر ہوتی ہے وخیر الامور اوسطہا۔

سوم - یہ خیال بھی کہ میزبان و مہمان عموماً ساتھ ہی کھانا کھاویں ترک کرنا چاہیے کھانے کے معمولی وقت پر اگر کوئی فریق غیر حاضر ہو تو اُس کی حاضری کا انتظار نہ کیا جاوے اور فریق غیر حاضر کو دوسرے فریق کی اس کارروائی سے آزردہ نہ ہونا چاہیے۔

چہارم - تخلیہ کے موقع کا بھی جہاں تک ممکن ہو خیال رکھنا چاہیے تاکہ مہمان اور میزبان دونوں کو آرام ہو ہر وقت کے پاس اُٹھنے اور بیٹھنے سے تکلیف بھی ہوتی ہے اور ملاقاتوں سے بھی جی گھبرا جاتا ہے۔ اور امراء طرز عمارت کا بھی خیال کریں۔

پنجم - آمدن بہ ارادت و رفتن بہ اجازت کے غلط اصول کو بھی منسوخ کرنا چاہیے اور دونوں باتیں آنے والے ہی کی مرضی پر منحصر کرنی چاہئیں

تاکہ ہر شخص اپنے کوچ و مقام کا انتظام ٹھیک کر سکے۔

(از تہذیب الاخلاق حصہ ۴)



دوستی کا برتاؤ

(از آنریبل سیّد محمود مرحوم)

تہذیب الاخلاق کے نمبر اول جلد دوم میں ہم ایک مضمون دوستی پر لکھ چکے ہیں اُس میں ہم نے صرف اصول اور فوائد دوستی پر بحث کی تھی اس مضمون میں دوستی کے برتاؤ کی نسبت اپنے خیالات ظاہر کرنے منظور ہیں۔

سب اس بات کو مانتے آئے ہیں کہ دوستی انسان کی راحت کو دو چند اور مصیبت کو نصف کر دیتی ہے یعنی ہماری خوشی میں دوست بھی ہمارے ساتھ خوش ہو کر اُس خوشی کو دو چند کر دیتا ہے اور غمی میں دوست کی ہمدردی سے رنج کا آدھا بوجھ ہم پر سے ٹل جاتا ہے اگرچہ یہ قول بالکل سچّائی پر مبنی ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ بہت سے دوست رکھنے بہتر ہیں عقلاء متقدمین میں سے ایک کا قول ہے کہ بہت سے

ہوا خواہ بنا مگر دوست بہت کم۔ سب کے ساتھ امن سے رہ مگر ہزار میں سے ایک کو اپنا اصلاح کار بنا۔" یعنی دوستی کم آدمیوں سے کر اور کسی کو دشمن نہ بنا کیونکہ دوستی کا نباہنا مشکل ہے دوستوں کی تعداد کے ساتھ ہماری مشکل بڑھتی جاتی ہے اور دشمن سے اپنے تئیں محفوظ رکھنے میں ہمیشہ دقت ہوتی ہے بگڑے ہوئے دوست سے زیادہ کوئی خطرناک دشمن نہیں وہ ہمارے عیوب اور بھیدوں سے واقف ہوتا ہے اور ہزارہا ایسی مضرتیں پہنچا سکتا ہے جو کہ ناواقف دشمن کے اختیار میں نہیں ہوسکتیں۔

سب سے آسان دوستی وہ ہی جس کا ہم نے اپنے مضمون سابق میں اول ذکر کیا تھا یعنی وہ جو کہ بغیر آپس کی شناسائی کے ہوتی ہے ایسی محبت میں ہمیشہ ہمکو اختیار رہتا ہے کہ کس قدر دوستی رکھیں اور اُس کے بالکل موقوف کرنے میں کچھ اندیشہ نہیں ہوتا کیونکہ اُس حالت میں کوئی اپنا دشمن نہیں بنتا مگر یہ دوستی ادنٰے قسم کی دوستیوں میں شمار ہوتی ہے اور چونکہ جسقدر دوستی کی مقدار قلیل ہوتی ہے اُسی قدر اُس سے حظ اور فائدے بھی کم حاصل ہوتے ہیں پس صرف اسی دوستی پر قناعت کرنی نہ چاہیے۔

البتہ دوسری قسم کی دوستی جس کا اب ہم ذکر کرتے ہیں سب سے

زیادہ کارآمد ہے اور عام برتاؤ میں آتی ہے یعنی وہ محبت والفت جوکہ بسبب ربط وارتباط کے پیدا ہوتی ہے اور جس سے صحبت کی خوشی اور اصلاح کی درستی مترتب ہے سب سے مقدم شرط اس دوستی کی یہ ہے کہ دونوں شخص اپنے مرتبہ دنیوی کو بھول جاویں اور گوایک دوسرے سے دولت و منزلت میں بدرجہا بڑھکر ہوا ہی حالت دوستی میں ایک دوسرے کو برابر سمجھے بعد اس شرط کے ثابت قدمی اور صداقت طینت سے ہے یعنی تلوّن مزاجی اور بدباطنی دونوں میں نہو- ایسے دو شخصوں میں کامل دوستی نہیں ہوتی جن میں سے ایک اپنے تئیں دوسرے سے اعلےٰ سمجھے یا جوکہ ثابت قدم اور صاف باطن نہو لیکن بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو دوستی میں اپنے رتبہ کو خیال میں نہ رکھیں اور یہ ہی مقدم باعث ہے کہ مختلف درجہ کے آدمیوں میں دوستی کا ہونا شاذونادر ہے۔

ہم یہ پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ سچے دوست سے بڑھکر دنیا میں کوئی دولت نہیں وہ رنج و خوشی میں یکساں ہماری ہمدردی کرتا ہے مگر ہمکو اُس سخت عیب کا ذکر نہ بھولنا چاہیے جوکہ دوستی کے ایک بڑے حظ کو خراب کردیتا ہے ہماری مراد اُس بیہودہ مشغلے سے ہے جس کو دل لگی یا ہنسی یا مزاح کہتے ہیں ہم ہنسی یا مزاح کے فی نفسہ دشمن نہیں بلکہ ضرور کہ

کہ جب دو دوست بالکل گھُل مِل جاویں تو آپس میں اپنی خوشی کے لیے کچھ ہنسی کی باتیں کریں مگر ہم اُس طرز ہنسی کے برخلاف ہیں جس سے اکثر محبت میں فرق آتا ہے۔ یہ وہ طریقہ مزاح کا ہے جس سے دوست کو بجائے خوش کرنے کے رنج دینا ہے یعنی اپنے دوست کی کسی سچ بات سے ہنسی کرنی مثلاً ہمارے دوست میں ایک عیب ظاہری ہے اب ہنسی میں اُس عیب کی طرف کسی قسم کا اشارہ کرنا گویا اُس کے بُرے ہونے کو جتانا ہے اور یہ بالکل نامناسب ہے کیونکہ وہ ہنسی ہنسی نہیں جو کہ سچ ہو بلکہ ایک نوع کی گالی ہے اور اپنے دوست کی ہجو اور اہانت کر کے اُس کو رنج دینا ہوتا ہے۔

علاوہ اس طرز ہنسی کے آج کل ایک اور طرز دوستی کا یعنی آپس میں گالم گلوج کا ہونا کمال محبت سمجھی جاتی ہے اس جگہ اُس کی مذمت کرنی ہم ضرور نہیں سمجھتے کیونکہ ایسی بحث زیادہ تر اس موقع پر چسپاں ہوگی جہاں کہ شریف شخص کی تہذیب کا ذکر ہو۔

ایسے بھی لوگ ہیں جو کہ نہایت مختصر عرصہ میں بڑی دوستی کا دعوےٰ کرنے لگتے ہیں اور گو دل میں محبت نام کو بھی نہ ہو مگر ہمارے ساتھ ہر قسم کی ہنسی کا اپنے تئیں مجاز سمجھتے ہیں۔ اکثر ایسے ہی لوگ رنج دل میں ڈالنے والی ہنسی کے بہت شوقین ہوتے ہیں اور خود بیہودہ خوشی حاصل

کرتے ہیں مگر اس سے بھی بدتر ایک اور کمینی عادت ہے کہ ہنسی کے پردہ میں کسی کو طعنہ دینا یا ایسی بات اشارتاً کہنی جو کہ حقیقت میں اُن کو کہنی منظور تھی مگر اپنی بدباطنی کے سبب صاف نہ کہہ سکتے تھے یہ بات ذرا غور سے سمجھ میں آوے گی اگرچہ ہر شخص کو اپنی زندگی میں ایسے لوگوں سے پالا پڑتا ہے۔

اصل ہنسی وہ ہے جو کہ ایسی بات کی نسبت جو ہمارے دوست کا عیب نہیں یا جس کے ذکر سے اس کو رنج نہو۔ ایک قسم کی بات گڑھنے سے اگر ہمارے دوست کو کچھ جھنجھلاہٹ آوے تو وہ غصہ ہرگز مؤثر نہیں ہوتا اور نہ اس سے کچھ ہرج ہوتا بلکہ تھوڑے عرصہ کے بعد سب کو اُس سے خوشی ہوتی ہے خود اس دوست کو جس کی کہ ہنسی کی گئی تھی لطف آتا ہے ہمکو یہ بھی بیان کرنا ضرور ہے کہ ہنسی میں کوئی جھوٹ بات بیان کرنی جایز نہیں سوائے اُس کے جس کی غلطی صریح ہو۔ ایسا جھوٹ جھوٹ نہیں کیونکہ وہ اپنے جھوٹ ہونے کو خود صاف دکھاتا ہے اور اُس سے کسی قسم کا ہرج نہیں ہوتا۔

ایک اور بات پر غور کرنا چاہیے۔ یہ مقولہ سب دوستوں میں مشہور ہے کہ دوست کا مال اپنا ہی ہوتا ہے۔ یہ نہایت اعلیٰ اور عمدہ قول ہے مگر افسوس کی بات ہے کہ اس کا بھی برتاؤ بُری طرح پر ہوتا ہے اکثر یہ

معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص اس سبب سے کوئی اچھی شی نہیں رکھتا کہ اُس کے ملاقاتی اُس کے پاس وہ شے نہیں رہنے دیتے "دوست اچھی شے نہیں چھوڑتے" یہ اکثر سننے میں آتا ہے۔ کوئی شے اس سے زیادہ شریف اور اعلیٰ نہیں کہ محبت میں اپنے اور اپنے دوست کے مال کو ایک سمجھے اور اپنی سب چیزوں کو گویا اُس کے لیے سمجھے مگر اس سے زیادہ کوئی حقیر بات نہیں کہ باوجودیکہ ہمکو معلوم ہے کہ ہمارے دوست کو ایک شے نہایت پسند ہی اور اس لیے اُس کو عزیز رکھتا ہے پھر بھی ہم اُس سے اُس شے کی درخواست کریں۔ غور کرنے کی بات ہی کہ اس کا اصول کس قدر غلط ہے اگر ہم اپنے دوست کی ایسی شے کو پسند کریں جس سے اُس کو کسی قسم کی آسایش یا خوشی ہو تو کس قدر محبت کے خلاف ہی کہ اُس سے وہ لیکر دوست کی خوشی یا آسایش میں خلل انداز ہوں اگر وہ شے ہماری دانست میں عمدہ ہے تو ہمکو چاہیے کہ یہ خواہش کریں کہ ہم سے پہلے ہمارا دوست اچھی شے رکھے اور خوشی اور آسایش حاصل کرے نہ یہ کہ اُس سے وہ لیکر محبت کے برخلاف بات کریں۔ باوجودیکہ ہماری دانست میں اپنا اور دوست کا مال ایک ہے لیکن تاہم اُس سے وہ چیزیں لینی چاہئیں جو کہ ہماری ہی دانست میں عمدہ ہیں مگر اُس کو کچھ چنداں عزیز نہیں یا اُس حالت میں اُن کی درخواست کی جاوے جبکہ

ہمکو کچھ شک نہو کہ اُس خاص شے کے لینے سے ہمکو اپنے دوست کی آسایش سے (جو کہ اُس چیز خاص سے اُس کو ہوتی ہو) بدرجہا بڑھکر ہوگی اگر اس طرح بھی محبت میں فرق آئے دیکھا ہے کہ ایک شخص نے اپنے دوست سے ایک شے کی درخواست کی اور اُس نے انکار کیا تو ظاہر ہے کہ محبت میں فرق پڑا سچی دوستی کو ایسی حالت میں یہ مقتضی ہے کہ اگر درخواست کنندہ کو یہ معلوم نہ ہو کہ فلاں شے دوست کو نہایت عزیز ہے اور اس ناواقفیت کی حالت میں درخواست کی ہے تو معلوم ہوتے ہی اپنی درخواست کو واپس لے اور اُس شے کے لینے پر مصر نہ ہو اس بات کو غور سے سمجھ لینا چاہیے کہ کسی شے کا جو کہ ہمارے دوست کو عزیز ہے مانگنا اُسی قدر محبت کے خلاف ہے جس قدر کہ اُس دوست کا اُس شے کی درخواست کے بعد نہ دینا - اگر کوئی وجہ خاص ایسی درخواست یا انکار کی ہو تو سچے دوستوں کو لازم ہے کہ صاف بیان کردیں ورنہ یہ کہ محبت میں خلل آجاوے -

کیا اچھا قول ہے کہ دوست حقیقی ایک بہت مضبوط پناہ ہے اور جس نے ایسا دوست پا لیا تو ایک بڑا خزانہ پایا سچا دوست زندگی کے امراض کی دوا ہے اور جو لوگ دل سے نیک ہیں اپنی نیکی کے صلہ میں ایسا دوست پاویں گے - سب سے خوبصورت اور غور و تامل کے لایق اس مقولہ کا اخیر حصہ ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ اپنی طبیعت کی نیکی اور دل کی صفائی کے

بغیر ہمکو سچّا اور وفادار دوست نہیں ملتا۔

دل را بدل رہے ست دریں گنبد سپہر

وہ شخص جوکہ خود صاف اور نیک ہے ضرور کبھی نہ کبھی اپنا سا دوست پاویگا اور گو اپنی صفائی کے سبب اُس کو کبھی بد لوگوں سے مضرّت پہنچے مگر بلاشبہ سچّے دوست کے ملنے سے محروم نہ رہے گا مگر بد باطن کو کبھی اچھا دوست نہیں نصیب ہوتا اگر اُسی کی سی خاصیت کا شخص ملا تو وہ اس کی نسبت اتنا ہی شبہ کریگا جتنا کہ یہ اُس کی نسبت اور کبھی کھل کر دوستی نہیں ہونے کی۔ اگر بد باطن شخص کسی صاف باطن سے ملے تو اُس کو اُس کی نسبت بھی اپنی بدطینتی کے سبب شبہ رہے گا اس بات کی فکر میں رہے گا کہ اُس کے بھید معلوم کروں اسی خواہش میں مبتلا ہو کر چھپ چھپ کر باتیں سُنے گا اور اگر اتفاقاً کوئی ایسی بات سُن پائی جو اُس کی دانست میں اُس کے برخلاف ہوئی تو اُس کو اپنی غیبت تصوّر کر کے اپنے دل میں اپنے تئیں مبارکباد دیگا کہ کس ہوشیاری سے بھید معلوم کیا گو وہ بات جو کہ اُس نے چھپ کر سُنی (اور اس طرح پر بات سننے اور چوری میں کچھ فرق نہیں) ایسی ہو کہ اُس صاف باطن شخص کو اُس کے روبرو کہنے میں بھی کچھ تامل نہوتا ایسے شخص کو کبھی سچّے دوست کی سی نعمت نصیب نہیں ہوتی تعجب نہیں کہ تھوڑے عرصہ تک صاف باطن اس بد باطن شخص کو اچھا اور صادق دوست سمجھے مگر نہایت جلد اُس کے حرکات

سے اُس کی خاصیت کھُل جاتی ہے اور صاف آدمی اپنے اس ملاقاتی سے متنفر ہو جاتا ہے۔

جتنا دوست پُرانا ہوتا جاتا ہے اُتنی ہی قدر بڑھتی جاتی ہے اور گو اکثر ہمکو نئے دوست کی وفا پر اتنا ہی بھروسہ ہو جاتا ہے جتنا کہ پُرانے دوست پر مگر تاہم پُرانے دوست کے ساتھ زیادہ تجربہ زندگی کا ہوتا ہے اور اسی وجہ سے کہ وہ قدیم ہے اُس کی قدر زیادہ ہوتی ہے گرم گرمی دوستی بڑے اندیشہ کی شے ہے اور اُس کے برقرار رکھنے کے لیے ہم کو بڑی احتیاط لازم ہے۔ ایک دفعہ دوستی ٹوٹنے کے بعد گو عقلمند اور عالی ہمّت شخص اُس شخص کا جو کہ اُس کا دوست تھا قصور معاف کر دیگا مگر پھر دوستی کا ہونا مشکل ہے اور میری دانست میں اُس شخص سے جو کہ ہمارے ساتھ دوستی کا دعوےٰ کر کے ہمارے ضرر کی بات وابستہ کرے دوستی پھر نہ کرنی چاہیے گو اُس کا قصور بالکل دل سے معاف کر دے اور صلح کر لے۔ اگر یہ معلوم ہو جاوے کہ وہ حرکت جس سے ہم نے ناراض ہو کر ملاقات ترک کی تھی حقیقت میں دشمنی کی نہ تھی تو پھر محبت کے جاری کرنے میں کچھ حرج نہیں اور ایسی بات کو اگر کوئی شخص معاف نہ کرے تو وہ بہت بے رحم اور بے مرّوت سمجھا جانا چاہیے۔

ایک عقلمند کا مقولہ مشہور ہے کہ " اپنے دشمنوں سے دور رہ اور دوستوں

سے ہوشیار" گو یہ قول ایک دانا شخص کا ہے مگر ہم اس کے اخیر حصہ سے متفق نہیں۔ وہ دوستی کیا جس میں کہ دوست پر کچھ بھروسا نہ کیا جاوے اور وہ محبت کیا کہ جس میں اپنے دوست کی وفا پر شبہ رہے۔ شاید یہ قول دنیا کے کاروبار میں نہایت ٹھیک ہو مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارے خیالات دوستی کے قطعاً برخلاف ہے۔ اس مقولہ سے گویا یہ سکھاتا ہے کہ دوست کو بھیدوں سے مطلع نہ کرے مگر ایسی حالت میں سب سے بڑا فائدہ دوستی کا جاتا رہتا ہے۔ وہ شخص نہایت نادان بلکہ خائن ہے جو کہ اپنے دوست کے بھیدوں سے دوسروں کو مطلع کرتا پھرے ہم کو اختیار ہے کہ جس کو چاہیں اپنا رازدار بنا دیں مگر یہ بے شک امانت کے برخلاف ہے کہ اپنے دوست کے بھیدوں کو غیروں پر کھول دیں۔ الغرض اپنے دوست کی بڑی خاطرداری لازم ہے اور کوئی بات اُس کو رنج دینے والی نہ کرنی چاہیے۔ مصراع

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

بڑے دوست کی ذرا سی محبت کے برخلاف بات سے بڑا رنج ہوتا ہے اور ایک ایسی دل شکنی کے بعد دوستی کا جاری رہنا دشوار ہے کیونکہ۔ دل را شکستہ نہ کہ گوہر شکستہ۔

ہم نے اپنے مضمون سابق میں (جس کا یہ مضمون گویا تتمہ ہے) اُن

فواید کا ذکر کیا تھا جو کہ ہمارے دوست سے ہمکو ہوتے ہیں یہ سب فائدے
اکثر دوست کے اپنے بغیر کچھ تکلیف اُٹھاے یا کچھ دولت صرف کیے نہیں
ہوتے اور اس لیے اُن کے سبب ہم پر اُس کا بڑا احسان ہوتا ہے ایسے احسان
کے معاوضہ میں صرف اُس سے محبت زیادہ کرنی چاہیے اور مقولہ مشہور
"حساب دوستاں در دل" نہایت غلطی پر مبنی ہے اگر اس مقولہ کے
معنے یہ سمجھے جاویں کہ جب کوئی دوست ہمارے لیے اپنی کچھ دولت صرف
کرے یا کسی اور طرح ہمکو ممنون کرے تو اُس کے احسان کو ہم اپنے دل میں
رکھیں اور موقع پر اُس کو اُتار دیں۔ ہم اس بات کے بیان کرنے سے
باز نہ رہیں گے کہ یہ معنے اس مقولہ کے ہماری راے میں محض غلط ہیں۔
جس وقت کہ ہم اس اصول کو قبول کرلیں تو ظاہر ہے کہ اپنے دوست کا احسان
لینا گویا قرض لینا ہے اور ضرور ہے کہ ایسے احسان کا بوجھ اس قدر ناگوار ہوتا ہی
کہ برداشت نہیں ہوسکتی قرض کو تو بوقت مقدور اُتار بھی سکتے ہیں مگر ایسے
احسان سے تو جان چھٹانی مشکل ہوتی ہے اس لیے بدلے اسکے کہ ضرورت کے
وقت اپنے دوست کی سعی و کوشش کو کام میں لاویں ایک خواہش اس کے
برخلاف پیدا ہوجاتی ہے فی الحقیقت دوستی مثل بازار میں سودا خریدنے
کے ہوجاتی ہے احسان لیا اور اُتار دیا جیسے سودا لیا اور دام ادا کیے۔ دوست
کی دوستی سے کیا فائدہ اگر اُس کے احسان کو لیکر ہم اپنے پر اُس کا اُتارنا واجب

سمجھیں اور کیا یہ محبت کے برخلاف نہیں ہے کہ اُس کے احسان کو ہم اپنے پر بار یا فرض سمجھیں ہاں یہ محبت کا مقتضی ہے کہ جہاں تک ہم سے ہو سکے اپنے دوست کی بہبودگی کے لیے کوشش کریں مگر اس سعی کو اس نیت سے کرنا کہ اُس کا احسان ہم پر سے ٹل جاوے بد باطنی میں داخل ہے۔ احسان ہم پر سے کبھی ٹل نہیں سکتا کیونکہ احسان کنندہ کو احسان کرتے وقت کچھ معاوضہ ملنے کی توقع نہیں ہوتی وہ صرف از راہ محبت ایک کام ہمارے فائدہ کا کرتا ہے۔ اس سے ہم اُس کے ممنون ہوتے ہیں ایسا احسان صرف اس سبب سے کہ اول کیا گیا ہے بعد کے ہزار احسانوں سے بھی نہیں اُترتا بعض لوگ اس نیت سے احسان کسی پر کرتے ہیں کہ وہ شخص ہمیشہ اُن کا ممنون رہے ایسی حالت میں گو اُس شخص کو ہمیشہ احسان مند رہنا زیبا ہے مگر اُس احسان کی خود قدر گھٹ جاتی ہے ایسے ہی احسان کرنے والے بعد کو احسان جتایا کرتے ہیں اور واقع میں احسان کر کے بھول جانا یا سوائے محبت کے اور کسی قسم کی عوض کی امید نہ رکھنا بہت عالی ہمت اور شریف لوگوں کا کام ہے۔

گو اوپر کے فقرے میں دوست کے احسان اُتارنے کی خواہش کو ہم بُرا کہہ آئے ہیں مگر ہم اُس بد باطنی کی بھی مذمت کرتے ہیں جو کہ خواہش مذکورہ بالا کی ضد ہے یعنی اس بات کی خواہش رکھنا کہ جس دوست پر

ہم احسان کر چکے ہیں اُس کا احسان نہ لینا چاہیے تاکہ ہمارا احسان اُس پر سے اُتر نہ جاوے۔ جس شخص میں ایسی خواہش ہوتی ہے وہ کبھی سچّا دوست نہیں ہوتا اور اُس کا احسان نہایت ناگوار گذرتا ہے کیا اُس نے ہمکو بے بس یا بے مقدور سمجھکر احسان کیا تھا یا یہ کہ ہمکو فقیر و ذلیل اور اپنے تئیں امیر و کبیر اور ہم سے مرتبہ میں اعلیٰ سمجھتا ہے کہ ہم جو اُس کی خدمت محبت سے کرنی چاہتے ہیں اُس کے قبول کرنے میں اُس کو عار ہے ہاں اگر دوست کو تکلیف دینے میں ہمکو تامل ہو تو یہ عین محبّت ہے مگر اس غرض سے اُس سے کسی بات کی درخواست نہ کرنی یا اُس کی دولت کے نہایت قلیل حصہ کو بھی اپنے لیے صرف نہ ہونے دینا کہ ہمپر اُس کا احسان نہ ہونے پاوے یا یہ کہ ہمارا احسان اُس پر سے نہ اُتر جاوے بدباطنی اور نفاق میں داخل ہے۔

ایک اور بات کا ہم مختصر ذکر کرتے ہیں۔ زندگی کے تجربہ سے اکثر معلوم ہوا ہے کہ جب کبھی دوستوں میں لین دین شروع ہوا دوستی میں غالباً خلل واقع ہوتا ہے اس لیے ہماری دانست میں دوست کو ہمیشہ قرض حسنہ دے کہ اگر بالفرض وہ ادا نہ کرسکے تو محبت شکنی نہ ہو یہ بہتر ہے کہ اگر دوست قرض مانگے تو صاف بیان کردے کہ مقدار خاص سے زیادہ وہ دے نہیں سکتا اور اگر ایسے انکار سے کوئی دوست ناراض

ہو تو اُس کا قصور ہے۔

ہم نے ایک بڑے شخص کے مُنہ سے یہ مقولہ سُنا ہے کہ "دوست راامیاز ما"، مگر اس کے معنے ہرگز یہ نہیں کہ اُس کے احسان لینے سے یا وقت ضرورت مدد کی درخواست کرنے سے عار رکھ بلکہ یہ معنے ہیں کہ بلا ضرورت صرف اپنے دوست کی وفا آزمائی کے واسطے اُس سے کوئی درخواست نہ کرنی چاہیے کیونکہ آزمانا صرف شبہ کی حالت میں ہوتا ہے اور وہ دوست صادق نہیں جو اپنے دوست کی وفا پر شبہ کرے۔ زمانہ خود ہر شخص کی خاصیت کو کھول دیتا ہے پھر ہم کیوں اپنے دوست کی نسبت بدگمانی کریں جب تک ممکن ہو اُس کو اپنا دوست سمجھیں اور اگر اخیر کو وہ بدباطن نکلے تو صرف خاموش اور علحدہ ہو جاویں مگر اول ہی آدمی کے پہچاننے میں ہمکو احتیاط چاہیے تاکہ آخر کو ندامت نہو۔

؎ چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی۔

(از تہذیب الاخلاق جلد ۴)



محسنُ الملک مرحوم

(از مولوی عبدالحق صاحب بی اے - حیدرآباد دکن)

اگر غور سے دیکھا جائے تو انسان کا آنا اور جانا یعنی پیدا ہونا اور مرنا دونوں ایک سے فعل ہیں - دونوں فعل اُس کے بس سے باہر ہیں - نہ اپنی خوشی آتا ہے - نہ اپنی خوشی جاتا ہے - اور نہ معلوم کہاں سے آتا ہے اور کہاں جاتا ہے - اور شاید جہاں سے آتا ہے آخر وہیں چلا جاتا ہے - یہ اسرار ہیں اور اسرار رہیں گے - لیکن اتنا یقین ہے کہ ان دو منزلوں کے درمیان جو وقفہ ہے اور جو گنتی کی چند سانس انسان کو عطا ہوئی ہیں وہی اس کی حیات ہے - وہی اس کا سرمایہ - وہی اس کی دنیا اور وہی اس کی آخرت - اسی میں اس کی زندگی ہے اور اسی میں اس کی نجات - اور اسی میں اس کی موت ہے اور اسی میں اس کا عذاب - گویا یہ چند دن امتحان کے ہیں اور دنیا دامِ ترغیب ہے - اس میں جو پورا اُترا اس نے حیات جاودانی پائی اور جو رہ گیا سو رہ گیا -

دنیا کی رونق اور ترقی اُنھیں نفوس کے دم سے ہے جو یہاں

کی کڑی کڑوی جھیل کر اور پیچ در پیچ ترغیبات کے پھندوں سے نکل کر امتحان میں پورے اُترتے ہیں۔ ان کی کمی سے دنیا کو زوال اور ان کی ترقی سے دنیا کو ترقی ہے۔ اسی طرح جس قوم میں ایسے لوگ پیدا نہیں ہوتے اور بہت کم ہوتے ہیں وہ معرض زوال میں ہیں اور جہاں ان کا سلسلہ جاری ہے وہاں ترقی و اقبال شامل حال ہے۔

ہماری قوم میں ایک مدت سے قحط الرجال ہے۔ اور جو ایک آدھ خدا کا بندہ اس زمانہ میں پیدا ہوا تو ایسے وقت میں داغ مفارقت دے کے چلا گیا جبکہ اس کی ضرورت اور بڑھ گئی تھی اور جبکہ اس کے افادہ کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا۔ سرسیّد نے اسّی برس کی عمر میں انتقال کیا۔ لیکن ہمارے حساب سے وہ بے وقت مرے۔ اب ان کے جانشین قوم کے سردار۔ ملک کے محسن۔ محسن الملک ستّر برس کی عمر میں ہمیں چھوڑ کر گئے ہیں۔ مگر ہم یہی کہیں گے کہ یہ موت بھی بے وقت ہوئی۔ اس لیے کہ جو کام محسن الملک کر رہے تھے وہ جوانوں سے بھی نہ ہو سکا۔ اُس ایک اکیلے بڈھے کا کام اتنا بڑا تھا جس سے ہزار دو ہزار نہیں بلکہ لاکھوں کے منہ پھر گئے۔ اور اگر سچ پوچھو تو اُس نے ایسے وقت جبکہ خانۂ قوم کی بنیاد متزلزل ہو رہی تھی اور مسلمانوں کی آنکھیں آسمان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ دل دھڑک رہا تھا۔ وہ کام کیا جو چھ کروڑ

نفوس سے نہوسکا۔ اس کی مردانہ ہمت اور اس کی مصلحت اندیشی ہماری قوم میں یاد رہے گی۔ اس نے بقول حالی سرسیّد کے مشن کو اس طرح پورا کیا جس طرح پال نے مسیح کے مشن کو پورا کیا۔ اس نے اپنے ہادی کے مرنے پر صلیب کندھے پر اُٹھائی اور بزرگ سیّد کے قدم بقدم چلکر اور ساری آفات سہکر آخر بیڑے کو کنارے پر جا لگایا جو ناخدا کے چل بسنے سے بھنور میں پھنس گیا تھا۔

میرے خیال میں ایک بڑے شخص کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ جب تک وہ زندہ ہے اور اپنے کام پر ہے دوسرے شخص کی ضرورت محسوس نہو۔ اور اُس کے سوا کسی دوسرے پر نظر نہ پڑے یہی حال مرحوم کا تھا۔ جب تک اس کے دم میں دم رہا ساری قوم نے اسے بالاتفاق اپنا سردار تسلیم کیا۔ اور جس کام میں اس نے ہاتھ ڈالا اُسے اس خوبی اور سہولت اور کمال سے ادا کیا کہ سب کو یقین ہوگیا کہ اس سے بہتر دوسرا شخص نہیں کرسکتا۔

یہ بڑے شخص کے پہچاننے کی علامت ہی۔ لیکن بڑا شخص درحقیقت کون ہے؟ ہم بڑا شخص اسے کہیں گے جو ایثار کو کام فرماتا ہے۔ جو اپنے اغراض اور خواہشات پر لات مار کر دوسروں کی دست گیری کرتا ہے۔ جس طرح خودغرضی انسان کی سب کی مذموم صفت ہے اسی طرح ایثار

اس کا اعلیٰ وصف ہے۔ بلکہ سب سے بڑی نیکی سب سے بڑی عبادت ہی۔ بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ مرحوم میں یہ صفت نہ تھی؟ اس کے کارنامے۔ اس کی جاں فشانیاں اور اس کی سحر کاریاں ایک عالم پر روشن ہیں۔ اس نے ہمیشہ ایثار اور احسان سے کام لیا اور خاصکر اس کی زندگی کا آخری حصہ ایسے نیک اور اعلےٰ کاموں سے مملو تھا۔ کہ اگر اس کا صرف ایک ایک کام ایک ایک شخص کو تقسیم کر دیا جاوے تو ان میں سے ہر ایک بڑا شخص کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہی۔ وہ جامع حیثیات تھا اور اس نے ہر حیثیت کو بدرجہ اتم نباہا۔ وہ ملک کا دوست اور قوم کا عاشق تھا اور اس نے اپنی دوستی کا حق ادا کر دیا اس کی زندگی کی ایک ایک گھڑی اور ایک ایک لمحہ دوسروں کے لیے وقف تھا۔ وہ جب تک جیا اسی دُھن میں جیا۔ اور جب مرا تو اسی دُھن میں مرا اور رتبہ شہادت پایا۔ یہ لوگ بڑے لوگ ہیں۔ ان کے رتبے بہت اونچے ہیں۔ یہ شاہ راہ عالم کے رہنما پتھر ہیں جب تک زندہ تھے لوگوں کی رہبری کرتے رہے۔ اب مرنے کے بعد بھی دوسروں کی رہنمائی کریں گے۔ وہ مرے نہیں۔ جیتے ہیں۔ مگر اس طرح نہیں جیسے ہم جیتے ہیں۔ بلکہ اُن کی حیات حیاتِ ابدی ہے اور ان کی زندگی زندگیِ جاوید۔

اس میں شک نہیں کہ بولتی چالتی تصویر ہماری آنکھوں سے نہاں ہوگئی۔ وہ ہاتھ جس کے اُٹھنے سے ہماری امیدیں اُٹھتی تھیں اُٹھنے کے قابل نہیں رہا۔ وہ دماغ جو آڑے وقت پر ہمارے مشکلات کی گتھیوں کو آناً فاناً میں سلجھا دیتا تھا کام سے عاجز رہ گیا۔ اور وہ زبان جسکی جادو بھری تقریر سے مجمع کے مجمع دم بخود رہ جاتے تھے خاموش ہوگئی ہے لیکن اس کے کام ہمارے ساتھ ہیں۔ اس کے نقش قدم اُبھرے ہوے ہیں اور نقش فی الحجر ہیں۔ سیّد مرگیا مگر وہ اب تک ہمارے ساتھ ہے اس کا نام اُس سے زیادہ روشن اور اس کا کام اس سے زیادہ اُجاگر ہے۔ ہم جب کبھی کوئی قومی کام کرنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں بلکہ حقیقت میں محسوس کرتے ہیں کہ اس میں سیّد کا ہاتھ ہے۔ اب مہدی علی چل بسا۔ لیکن وہ اب بھی محسن الملک ہے۔

ان کی زندگی سے سبق سیکھو۔ اُن سے زندگی بسر کرنا سیکھو۔ ہزار کالج و یونیورسٹی سے بڑھکر یہ معلّم ہیں۔ وہاں علم ہے مگر بے مزہ اور بے نمک۔ اور یہاں اس عمل کا علم ہے جس میں اسرار حیات ہویدا ہوتے ہیں۔ اور جس پر ہزار دارالعلوم قربان ہیں۔ وہ بے جان ہے۔ اور یہ جاندار ہے۔ وہ جگ بیتی ہے اور یہ آپ بیتی ہے۔ اور اسی لیے یہ زیادہ کارآمد اور زیادہ پُر اثر ہے۔ غرض زندگی ان لوگوں کی اور

مرنا ان لوگوں کا بقول حالی ؎ یوں رہتے ہیں یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں۔

اے کالج کی مبارک زمین مسجد! دیکھ آج قوم کا جگر گوشہ اپنی زندگی کے مرحلے طے کر کے تجھ میں پناہ لیتا ہے۔ دیکھ تیرے پاس ہماری قوم کے دو لعل بے بہا اور بھی مدفون ہیں۔ آج ایک تیسرا گوہر شب چراغ اور آتا ہے۔ یہ اسی خفتہ بخت۔ حرماں نصیب قوم کی تین عزیز امانتیں ہیں جو تجھے داورِ محشر کے سامنے پیش کرنی ہونگی۔ یہ ہماری آنکھوں کے تارے تھے جو آج تجھ میں مدفون ہیں۔ لیکن یہ غروب ہو کر بھی اپنی روشنی چھوڑ گئے ہیں اور حشر میں پھر چمکیں گے۔ اے روشنی! جا۔ اے قوم کے تارے جا اور وہاں جا کے سو جا۔ جہاں قوم کے آفتاب اور ماہتاب پڑے سو رہے ہیں۔ شام ظلمت آپہنچی ہے۔ تاریکی چھا رہی ہے۔ اب اور تارے نکلیں۔ مگر تیری چمک کسی میں نہ ہو گی۔ جا اب عالمِ بقا میں جا۔ تیرا آنا مبارک ہوا۔ خدا تیرا جانا بھی مبارک کرے۔ تجھ پر تا قیامت خدا کی رحمتیں نازل رہیں۔



شاعری

(از محمد فاروق دیوانہ)

گلشنِ شاعری کی بہار دید کی متقاضی ہی۔ ہر گل اپنے حسن پر پھولا ہی۔ اور اپنی دلفریبی پر پھولا۔ غنچوں کا تبسّم مجازاً اُن کی حقیقت پر شاہد ہی۔ ڈالیوں کی لچک سے یہ رونق دوبالا ہو گئی ہی۔ مگر سادگی پسند طبیعتیں سبزے کے نظارے میں محو ہیں اور عاشق مزاج دل نالۂ قمری اور فغانِ بلبل سُن سُن کر سرد ہیں۔ جرات ہوتی ہی کہ زمین کسقدر زرخیز ہے جہاں ہر طبیعت اور مزاج کے مذاق کے موافق دلچسپیاں موجود ہیں۔ یہاں پر حکیم افلاطون پر افسوس آتا ہی جنھیں اس کی کوئی ادا نہ بھائی۔ اور شاعر وجود مخلّ نظر آئے ورنہ مبدء فیض نے اس کی آبیاری کے لیے ایسا سامان مہیّا کر رکھا ہے کہ کبھی یہ ہرا بھرا چمن خشک نہوگا۔ پھر پھولوں کی مہک۔ شاخوں کی لچک۔ طائرانِ خوش الحان کی چہک تعجب ہے جو کسی دل کو نہ لبھائے رہیں۔ قوّت متخیّلہ (امیجینیشن) اس باغ کی وہ باغبان ہے جو کبھی کسی شاخ کو ناموزوں طریقے سے بڑھنے نہیں دیتی۔ اسی نے شاعر کو تلمیذ الرحمٰن کا خطاب دلوایا اور اب وہ اسی نام سے ہر جگہ پکارا جاتا ہے۔

قوت متخیّلہ جس وقت خیالات کو الفاظ کا لباس پہنا کر اور استعاروں اور تشبیہوں کے زیور سے آراستہ کر کے بزم سخن میں پیش کرتی ہے تو

تو اہلِ بصیرت کو عجیب لطف آتا ہی۔ اس سے بڑ کر عبارت موزوں، گویا جو قدم بڑھتا ہی باقاعدہ اور نپا ہوا۔ اس خرام کا لطف سب سے بالا ہی۔ اور محاورے کی صفائی۔ زبان کی چاشنی کیسی نمکینی پیدا کر دیتی ہی کہ زبان اُس مزے کو بیان نہیں کر سکتی ہی۔ مصوّر اس قوّتِ متخیلہ کے عملو کو ایک تختۂ کاغذ پر دکھلاتا ہی۔ اور سنگتراش اسی کے بتائے ہو راستے پر اپنی چھینی چلاتا ہی مگر شاعر باتوں ہی باتوں میں وہ مرقع سامنے لا کھڑا کر دیتا ہی کہ آنکھیں کچھ نہیں دیکھتیں مگر دل میں اس کا عکس نمودار ہو جاتا ہی دیکھو ؎

آئے ہیں میرے منہ کو بنائے خفا سے آج + شاید بگڑ گئی ہی کچھ اُس بیوفا سے آج

شاعری خیالات کی خوبی اور نظم اُسے خوش اسلوبی کے ساتھ الفاظ میں لاتا ہی۔ زبان دانی سے مراد اس اظہار میں مدد دینا ہی اور استعارہ گویا اشاروں ہی میں اصل مدعا کو ادا کرتا ہی۔ کیونکہ درحقیقت جو لطف کنایوں میں باتیں کرنے میں آتا ہی وہ کہنے میں نہیں۔ مبالغے میں کسی بات کو حد سے بڑھا دیتے ہیں پھر بھی اپنے موقع پر وہ ایک مزے کی چیز ہے۔

شاعر کو قوتِ متخیلہ کی ضرورت اس لیے ہی کہ یہی شاعری کا مخرج ہی۔ عبارت موزوں یعنی نظم اس لیے رکھتے ہیں کہ وہی اس کا معیار ہے۔ ورنہ جسے شاعری کہتے ہیں وہ اس پابندی سے آزاد ہی۔ زباں دانی کی ضرورت یوں آن پڑتی ہی کہ ہر چیز کی تصویر لفظوں میں کھینچنی پڑتی ہی۔ پھر الفاظ کے معنی لغت میں کچھ اور، مگر روزمرّہ کے استعمال نے اُنھیں کچھ سے کچھ کر دیا ہے۔ اور اکثر موقعوں پر ایک لفظ سے جو کام نکلتا ہی وہ سطروں میں نہیں آنے کا۔ مثلاً ؎

رخصت اے ہندوستاں اے بوستانِ بیخزاں ✤ رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی میہماں
(حالی)

صرف ایک لفظ بدیسی نے پورا مطلب کس خوبی سے ادا کر دیا ہے۔

تشبیہ اور استعارے سے کسی چیز کی ٹھیک ٹھیک تصویر کھینچنے میں زیادہ مدد ملتی ہے اور دوسروں کے دلنشین کرنے میں اور بھی زیادہ۔ ان دونوں کی لفظی ترکیب کا فرق صاف ہے اور معناً دونوں یکساں ہیں مگر لطف میں زمین و آسمان کا فرق ہے دیکھو کمان ابرو، تیغ ابرو، اگر اسے یوں کہو کمان کی سی بھنویں اور تلوار کی سی بھنویں، تو بات وہی مگر مزہ نہیں۔ اور اگر یوں کہئے کہ تلوار کی طرح کھنچی ہوئی اور کمان کی طرح چڑھی ہوئی، تو اور ہی لطف آجاتا ہے مگر بات بڑھ گئی۔ پھر بھی کبھی کبھی سیدھی سادھی بات میں وہ لطف آتا ہے جس پر لاکھوں بناوٹیں قربان۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہر بات کا ایک موقعہ ہے اور یہ بتانے سے نہیں معلوم ہو سکتا بلکہ شاعر خود تلاش کر لیتا ہے اور اُس کی بتانے والی قوت متخیلہ ہے۔

شاعر جب اپنے خیالات کی روشن دنیا میں سیر کو نکلتا ہے تو اُسے وہ نظارے جو عام نگاہوں سے پوشیدہ ہیں دکھائی دیتے ہیں اور وہ ان پر سے حجاب دور کر کے اسے منظر عام بنا دیتا ہے۔ وہ بے زبانوں کی زبان سے باتیں سنتا ہے اور دوسروں کو اس طرح سے ادھر مخاطب کر دیتا ہے کہ سب وہی ترانہ سننے لگتے ہیں۔ خوب غور کرو ٥

ہر گیاہے کہ از زمیں روید ٭ وحدہٗ لا شریک لہٗ گوید

جب شاعری کے اسٹیج پر ایکٹ کرتا ہے تو ہر لحظہ نیا بھیس بدلتا ہے۔ کبھی ایک حسن پرست عاشق کی صورت معشوق کی زلف دراز کے خیال میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے اور نرگسی آنکھوں کی یاد میں حیران و سرگرداں۔ کبھی دنیا سے برداشتہ خاطر ہو کر معشوق حقیقی کے دھیان میں محو ہو جاتا ہے۔ ہر شے میں اُسی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ درختوں کے پتّوں پر خدا کی معرفت لکھی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور جو آواز کان میں آتی ہے وہ حمدِ خدا کا ترانہ معلوم ہوتا ہے۔ شجاعت کا جوش اُٹھا تو ایک نہیں ہزاروں ایسے جنگجو میدان میں لا کر کھڑے کر دیے جن کے آگے رستم ایک بچّہ معلوم ہوتا ہے اور زال کی حقیقت ایک بُڑھیا سے زیادہ نہیں نظر آتی۔ نعروں کی صداؤں سے گنبدِ گردوں گونج اُٹھا اور تحت الثرےٰ میں گاوزمین تھرا گئی۔ یکا یک بزم کا خیال آیا تو آسمان نیلگوں شامیانہ بن کر سایہ افگن ہو گیا۔ اور ستارے شمعیں بن گئیں جو اپنی اپنی جگہ پر روشن ہیں۔ زہرہ و مشتری کی گردشیں رقص کا لطف دیتی ہیں۔ ماہتاب جامِ شراب بھر بھر کر پیش کرتا ہے اور آفتاب کو صبوحی کا انتظام سپرد ہے۔ ایک مدت تک مجنون بنا، نجد کے ریگستان میں خاک چھانتا پھرا۔ پھر فرہاد کا روپ بھرا اور سر پھوڑ کر جان دی مگر مرنے پر بھی یادِ محبوب دل سے نہ گئی۔ اور

اور اس کشتۂ نازکو اب بھی حسرتِ وصل باقی ہے ؎

ہم غریبوں کا اندھیرے ہیں نکل جائیگا کام + آئیں تو وہ شمعِ تربت کے بجھانے کے لیے

کبھی مستی کے عالم میں باغ کی طرف جانا ہو گیا تو گلوں نے قہقہہ لگا جامِ شراب بھر کر نذر کیا۔ غنچے سر بمہر بوتلیں سامنے لائے۔ سبزوں میں سبزۂ مینا کی جھلک نظر آئی اور بلبلوں نے خیر مقدم میں زمزمہ سرائی کی۔ اس کے علاوہ پھولوں کا کھلنا گویا اُن کا منشا ہے اور کلیاں پھولی نہیں سماتیں۔ ہر چند ہنسی کو ضبط کیا مگر مسکراہٹ لبوں پر آ ہی گئی۔ شبنم کو یہ ادا بہت بھائی اور خوشی میں اس پر سے موتی لٹائے۔ ماہتاب نے چاندنی کا فرش بچھا دیا تاکہ صبا جو اس جلسے کی منتظم ہے اس پر سے ہو کر گذرے تو اُس کا پاؤں نہ میلا ہو۔ مگر وہ خود خوشی میں کب زمین پر پاؤں رکھتی ہے۔

اسی عالم محویت میں طبیعت نے پلٹا کھایا۔ دل میں حسرت و یاس کا اس درجہ ہجوم ہوا کہ خوشی کو رہنے کی جگہ نہ ملی۔ وہ عیش و عشرت کا سماں ماتم خانہ کا نظارہ ہو گیا۔ بلبل کی صفت نالاں ہے۔ اور شبنم الگ پتّوں میں مُنہ ڈھانپ کر رو رہی ہے۔ درخت اپنا سر دُھن رہے ہیں۔ پھول ہمہ تن گوش ہوش بنے بے ثباتیٔ عالم کا ذکر سُن رہے ہیں اور ؎

کلیاں من میں سوچت ہیں جب پھول کوئی کُملاوت ہیں

جو دن واکو بیت گیو ہے وا دن ہم کو آوت ہیں

سبزہ سبزہ بیگانہ ہے۔ نرگس عالم فانی کی نیرنگیاں دیکھکر حیرت میں ہے۔ سوسن زباں درازیاں بھولی ہے۔ اور سنبل نے اس غم میں زلفیں پریشان کرلی ہیں۔ سرو کو سکتے کا عالم ہے۔ اور تمام اشجار کف افسوس مل رہے ہیں۔ بے اختیار ہو کر دل بول اُٹھتا ہے ؎

ہاں بلبل اور گل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول ٭ گلگشت سرسری نہیں اس گلستان کا
گل یادگار چہرۂ خوباں ہے بے خبر ٭ مرغ چمن نشاں ہے کسی خوش زبان کا

الغرض ہمار اشاعر ہر گھڑی ایک نیا رنگ دکھاتا ہے اور ہر رنگ کو نئے طرز سے جلوہ دیتا ہے۔ دم میں کچھ، دم میں کچھ، مشرق کی سیر کی، مغرب کی خاک چھانی، ابھی جنوب میں تھا۔ ابھی شمال میں نظر آیا۔ خیال کے پر کھول کر اُڑا اور اوجِ سخن سے تارے توڑ لایا۔ پھر پستی کی طرف جُھکا تو تحت الثرے سے سوئی نکال لایا۔ کوہ قاف میں پریوں کا تماشا دیکھا اور پہاڑوں کے دامن سے کنکر پتھر چُن کر ایک نظر میں ہیرے سے بھی زیادہ چمکایا۔ پھر ہیرے کو اُٹھایا اور دم میں پتھر سے بھی زیادہ بے حقیقت کر دکھایا۔ بازارِ سخن کو طرح طرح کے مضامین سے سجایا کہ خریداران لطف سخن ٹوٹے پڑتے ہیں۔ کوتاہ بیں آنکھیں ہمیشہ عیوب کی تلاش میں رہتی ہیں۔ پھر بھی حقدار کا حق کہیں نہیں گیا ہے۔ چاہے حسد داد نہ دے مگر انصاف کا پنجہ اس کی گردن پر مضبوط پڑتا ہے۔ اور عدل حکمی کی سزا دیتا ہے۔ طبع سلیم کا یہ مقتضے ہے کہ ہر بات کے دونوں پہلوؤں پر

نظر ڈالے نہ کہ آنکھوں پر تعصب کی پٹّی باندھکر عیوب کو ڈھونڈھے یا طرفداری کی عینک لگاکر تھوڑی خوبی کو زیادہ دیکھے۔ مگر نیک نیتی کی نکتہ چینی بجائے ملامت کے مشفقانہ اصلاح ہوتی ہے۔ اور اس کی تجسس دل کو بڑھانے والی۔ شاعری کے متعلق خود شاعر کہتا ہے ؎

بہ موزونی نزول آہے بر آرم ✤ کنم کوہے وز ان کاہے بر آرم

یہاں کسی قدر تشریح کی ضرورت ہے۔ اگرچہ کندن وکاہ بر آوردن ایک بیکاری کا شغل ہے مگر یہ گھاس کیمیا کی بوٹی ہے جو مس خام کو کندن بناتی ہے۔

اللہ اللہ! جن لوگوں نے محض اس توقع پر کہ لوگ ان کے کلام سے اپنا دل بہلاکر خوش ہونگے اور داد دیں گے، اپنی تمام عمر اس فن کے ترقی دینے میں صرف کردی۔ ان کی اس کوشش کو رائیگاں تصور کرکے ان کی قدر نہ کرنا صریحاً انصاف کی آنکھ میں خاک ڈالنا ہے۔



حصہ نظم

غالب

قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سُنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنّتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور۔ نہ جوش و خروش ہی
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہگئی ہے سو وہ بھی خموش ہی
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ۔ نوائے سروش ہی



اقبال

ایک پرندے کی فریاد

آتا ہی یاد مجھکو گذرا ہوا زمانہ
وہ ساتھ سب کے اُڑنا وہ سیر آسماں کی
پتوں کا ٹہنیوں پر وہ جھومنا خوشی سے
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
لگتی ہی چوٹ دل پر آتا ہی یاد جس دم
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت

وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا مِل کے گانا
ٹھنڈی ہوا کے پیچھے وہ تالیاں بجانا
اپنی خوشی سے جانا۔ اپنی خوشی سے آنا
شبنم کا صبح آکر پھولوں کا منہ دُھلانا
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانہ

تڑپا رہی ہی مجھکو رہ رہ کے یاد اُسکی
تقدیر میں لکھا تھا پنجرے کا آب و دانہ

اس قید کا الٰہی دُکھڑا کسے سُناؤں
ڈر ہی یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں

کیا بد نصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں
آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں
باغوں میں بسنے والے خوشیاں منا رہے ہیں
میں دل جلا اکیلا دُکھ میں کراہتا ہوں

آتی نہیں صدائیں انکی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی۔ ای کاش میرے بس میں

ارمان ہی یہ جی میں اُڑکر چمن کو جاؤں
ٹہنی پہ گُل کی بیٹھوں آزاد ہوکے گاؤں
بیری کی شاخ پر ہو ویسا ہی پھر بسیرا
اُس اجڑے گھونسلے کو پھر جا کے میں بساؤں
چُگتا پھروں چمن میں دانے ذرا ذرا سے
ساتھی جو ہیں پُرانے اُن سے ملوں ملاؤں

پھر دن پھریں ہمارے پھر سیر ہو وطن کی
اُڑتے پھریں خوشی سے کھائیں ہوا چمن کی

جب سے چمن چھٹا ہی یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہی غم دل کو کھا رہا ہی
گانا اسے سمجھکر خوش ہوں نہ سُننے والے
دُکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہی
آزاد جس نے رہکر دن اپنے ہوں گذارے
اس کو بھلا خبر کیا یہ قید کیا بلا ہے

آزاد مجھکو کر دے او قید کرنے والے

میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

ناظر

جوگی

کل صبح کے مطلعِ تاباں سے جب عالم بقعہ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
مستانہ ہوائے گلشن تھی جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی وادی ایمن تھی ہر کوہ پہ جلوۂ طور ہوا
جب بادِ صبا مضراب بنی ہر شاخِ نہال رباب بنی
شمشاد و چنار ستار بنے ہر سرو و سمن طنبور ہوا
سب طائر مل کر گانے لگے عرفاں کی تانیں اڑانے لگے
اشجار بھی وجد میں آنے لگے دلکش وہ سماع طیور ہوا
سبزے نے بساط بچھائی تھی اور بزمِ سرور سجائی تھی
بن میں گلشن میں آنگن میں فرشِ سنجاب و سمور ہوا
تھا دلکش منظرِ دشت و جبل اور چال صبا کی مستانہ
اس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا ناظر دیوانہ



چیلوں نے جھنڈے گاڑے تھے پربت پہ چھاؤنی چھائی تھی
تھے خیمے ڈیرے بادل کے کُہرے نے قنات لگائی تھی
یہاں برف کے تودے گلتے تھے چاندی کے فوارے چلتے تھے
چشمے سیماب اُگلتے تھے نالوں نے دھوم مچائی تھی
یہاں قلہ کوہ پہ رہتا تھا اک مست قلندر بیراگی
تھی رکھ جٹوں میں جوگی کے اور انگ بھبوت رمائی تھی
تھا راکھ کا جوگی کا بستر اور راکھ کا پیراہن تن پر
تھی ایک لنگوٹی زیب کمر جو گھٹنوں تک لٹکائی تھی
سب خلق خدا سے بیگانہ وہ مست قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی مستانہ آنکھوں میں مستی چھائی تھی
جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں اور جھک کر میں نے سلام کیا
تب آنکھ اُٹھا کر ناظر سے یوں بن باسی نے کلام کیا



کیوں بابا ناحق جوگی کو تم کس لیے آ کے ستاتے ہو
میں پنکھ پکھیرو بن باسی تم جال میں آن پھنساتے ہو
کوئی جھگڑا دال چپاتی کا کوئی دعوے گھوڑے ہاتھی کا

کوی شکوہ سنگی ساتھی کا تم ہمکو سنانے آتے ہو
ہم حرص ہوا کو چھوڑ چکے اس نگری سے مُنہ موڑ چکے
ہم جو زنجیریں توڑ چکے تم لاکے وہی پہناتے ہو
تم پوجا کرتے ہو دھن کی ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی
ہم جوت جگاتے ہیں من کی تم اس کو آکے بُجھاتے ہو
سنسار سے یہاں مُکھ پھیرا ہے من میں ساجن کا ڈیرا ہی
یہاں آنکھ لڑائی پیتم سے تم کس سے آنکھ ملاتے ہو
اُس مست قلندر جوگی نے جب ناظر پر یہ عتاب کیا
کچھ دیر تو ہم خاموش رہے پھر جوگی سے یہ خطاب کیا



ہیں ہم پردیسی سیلانی مت ناحق طیش میں آ جوگی
ہم آئے تھے تیرے درشن کو چتون پر میل نہ لا جوگی
آبادی سے مُنہ پھیرا کیوں پربت میں کیا ہے ڈیرا کیوں
ہر محفل میں ہر منزل میں ہر دل میں ہے نورِ خدا جوگی
کیا مسجد میں کیا مندر میں سب جلوہ ہے وجہ اللہ کا
پربت میں نگر میں ساگر میں ہر اُترا ہی ہرجا جوگی
جی شہر میں خوب بہلتا ہی واں حُسن پہ عشق مچلتا ہی

واں پریم کا ساغر چلتا ہی چل دل کی پیاس بجھا جوگی
واں دل کا غنچہ کھلتا ہی ہر رنگ میں موہن ملتا ہے
چل شہر میں سنکھ بجا جوگی بازار میں دھونی رما جوگی



ان چکنی چپڑی باتوں سے مت جوگی کو پھسلا بابا
جو آگ بجھائی جتنوں سے پھر اُس پہ نہ تیل گرا بابا
ہی شہروں میں غل شور بہت اور حرص و ہوا کا زور بہت
بستے ہیں نگر میں چور بہت سادھو کی ہی بن میں جا بابا
ہی شہروں میں شورش نفسانی جنگل میں ہی جلوۂ روحانی
ہی نگری ڈگری کثرت کی بن وحدت کا دریا بابا
ہم جنگل کے پھل کھاتے ہیں چشموں سے پیاس بجھاتے ہیں
راجہ کے نہ دوارے جاتے ہیں پرجا کی نہیں پروا بابا
سر پہ آکاس کا منڈل ہی دھرتی پہ سہانی مخمل ہے
دن کو سورج کی محفل ہے شب کو تاروں کی سبھا بابا
جب جھوم کے یاں گھن آتے ہیں مستی کا رنگ جماتے ہیں
چشمے طنبور بجاتے ہیں گاتی ہے ملار ہوا بابا
یاں پنچھی ملکر گاتے ہیں پتیم کے سندیس سناتے ہیں

یا روپ انوپ دکھاتے ہیں پھل پھول اور برگ گیا با با

ہی پیٹ کا ہر دم دھیان تمھیں اور یاد نہیں بھگوان تمھیں

سِل پتھر اینٹ مکان تمھیں دیتے ہیں سکھی سے چھڑا با با

تن من کو دھن میں لگاتے ہو پیتم کو دل سے بھلاتے ہو

ماٹی میں لعل گنواتے ہو تم بندۂ حرص و ہوا با با

دھن دولت آنی جانی ہی یہ دنیا رام کہانی ہے

یہ عالم عالم فانی ہے باقی ہے ذاتِ خدا با با

غزلیات

انشا

کمر باندھے ہوے چلنے کو ہم سب یار بیٹھے ہیں

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی

تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں۔ ہم بیزار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنّا میں
نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں ناچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے اُفتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہاں صبر و تحمّل آہ ننگ و نام کیا شے ہے
میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم اکبار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

غالب

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائیگا سر۔ گر ترا پتھّر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
آئے ہو کل۔ اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں"
مانا کہ ہمیشہ نہیں۔ اچھا۔ کوئی دن اور

جانتے ہوے کہتے ہو ،، قیامت کو ملیں گے "
کیا خوب! قیامت کا ہی گویا کوئی دن اور

ہاں ای فلکِ پیر - جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا - گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

ناداں ہو - جو کہتے ہو کہ - کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہی مرنے کی تمنّا کوئی دن اور

ایضاً

سب کہاں - کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہمکو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو - نہ یوسف کی خبر

لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

جوئے خوں - آنکھوں سے بہنے دو - کہ ہی شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینہ میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں - تو مِٹ جاتا ہی رنج
مشکلیں مجھپر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

ایضاً

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہو
ہم سخن کوئی نہو - اور ہمزباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے

کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ایضاً

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
چال۔ جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہی
وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
نہ سُنو۔ گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو۔ گر بُرا کرے کوئی
روک لو۔ گر غلط چلے کوئی
بخش دو۔ گر خطا کرے کوئی
کون ہی۔ جو نہیں ہی حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

ایضاً

کوئی امّید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معیّن ہی
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ہی کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کیوں نہ چیخوں؟ کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہی پر نہیں آتی

کعبہ کس مُنہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

ایضاً

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا
عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے، دکھلائیں کیا
پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہی آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پہ سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہی ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ
مجھکو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا نمبر سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی

ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابر گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی ہے کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابر و بہار
لائے گا تابِ گرانباریِ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

ذوق

سہرا

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پہ سہرا
آج ہی یمن وسعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتیٔ زر میں مہِ نَو کی لگا کر سہرا

تابشِ حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رخِ پر نور پہ ہے تیرے منوّر سہرا

وہ کہے صلِّ علےٰ - یہ کہے سبحان اللہ
دیکھے مُکھڑے پہ جو تیرے مہ واختر سہرا

تا ہنی اور بنے میں رہے اخلاص بہم
گوندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھکر سہرا

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نواسنج نہ کیوں کر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار

تارِ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرایش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

اک گہر بھی نہیں صد کان گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطّر سہرا

سر پہ طرّہ ہے مزیّن تو گلے میں بدّھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو مُنہ پر سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک
کھول دے مُنہ کو جو تو مُنہ سے اُٹھا کر سہرا

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے
دمِ نظّارہ ترے روئے نکو پر سہرا

دُرِ خوش آبِ مضامیں سے بنا کر لایا
واسطے تیرے ترا ذوق ثناگر سہرا

جس کو دعوےٰ ہے سخن کا یہ سُنا دے اُس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

غزل

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اُس کو گر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا
اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دلِ بدخواہ میں تھا مارنا یا چشمِ بد بیں میں
فلک پر ذوقؔ تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

ایضاً

(مرزا غالب)

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے	آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار	یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں	کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود	پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
سبزۂ و گل کہاں سے آئے ہیں	ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے
ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید	جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر۔ ترا بھلا ہو گا	اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں	میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

انیس

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اُٹھا کے چلے
خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے
کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو ہم بچا کے چلے
مقام یوں ہوا اس کارگاہِ دنیا میں
کہ جیسے دن کو مسافر سرا میں آ کے چلے

طلب سے عار ہے اللہ کے فقیروں کو
کبھی جو ہو گیا پھیرا صدا سُنا کے چلے
انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے



مدارج دوستی

(از خان بہادر سید علی محمد شاد)

دوستی بھی عجب اک نعمتِ ربّانی ہے — ہیں جہاں تک صفتیں سب میں یہ لاثانی ہے
کامل الشان وہ ہے اس صفت کا جو بانی ہے — یہی پایندہ ہے اور کلّ جہاں فانی ہے
پست تر رفعتِ افلاک ہے اس کے آگے
یہ وہ دولت ہے کہ سب خاک ہے اس کے آگے

دوست وہ ہے نہ کبھی دوست سے جو منہ موڑے — سختیوں میں نہ کسی دوست کو دم بھر چھوڑے
دوست کے ساتھ اگر رشتۂ الفت جوڑے — زندگی بھر نہ کبھی بھول کے اس کو توڑے
رنج پہنچے بھی تو اقدام شکایت نہ کرے
لغزشیں دوست سے ہو جائیں تو نفرت نہ کرے

اس طرح دوست سے ہو دوست کو الفت جانی
جیسے مل جاتا ہی ہر رنگ میں جا کر پانی
آدمی ہی وہی اس وصف کا جو ہو بانی
یہ صفت بھی ہی بشر میں صفت وجدانی

دوستی طبع میں ہو مہر و ولا خصلت میں
غیر اپنے ہوں وہ انداز رہے خلقت میں

ہر قدم دوست کا ہر دوست کو واجب ہی خیال
رہے یہ دھن کہ کسی دوست کو پہنچے نہ ملال
میل دیکھے جو ذرا کرلے صفائی فی الحال
دل ہی آئینہ صافی کہیں پڑ جائے نہ بال

دوست رس دل پہ ہو جتنا اُسے جانے ہی نہ دے
بات مکروہ کوئی بیچ میں آنے ہی نہ دے

دوستی چیز ہی کیا لذت نفسانی ہے
جسم سے گر متعلق ہو تو جسمانی ہے
روح پر محض اثر ہو تو وہ روحانی ہے
ہو جو مذہب سے تعلق تو وہ ایمانی ہے

سب کے اسباب جدا گانہ ہیں سامان جدا
طرز و انداز جدا بات جدا شان جدا

دنیا کے تعلقات اور حضرت آدم و حوّا سے مکالمہ

وادیِ قدس کی طرف اک دن	میں تصوّر میں اپنے جا نکلا
کرسیِ نور پر بصد شوکت	ساتھ بیٹھے تھے آدمؑ و حوّا

بھولی بھولی ملیح وہ شکلیں | پیارا پیارا بھرا بھرا نقشا
اس بڑھاپے پہ رخ کا وہ عالم | دیکھیں یوسف اگر تو ہو سکتا
ایڑیوں تک وہ لمبے لمبے بال | قد کشیدہ درست سب اعضا
میں نے جاتے ہی جھک کے کی تسلیم | ہنس کے فرمایا خوش رہو بابا
میں نے کی عرض واہ دادا جان | یہ تو حضرت نے خوب فرمایا
خوش کسے کہتے ہیں کہاں کی خوشی | کون خوش ہے بتائیے تو ذرا
ایک دل اور خیال بے گنتی | ایک سر اور ہزارہا سودا
اونٹ کی کوئی کل نہیں سیدھی | جس طرف دیکھئے اُدھر کانٹا
کہیں روٹی کی فکر میں سرگرم | کہیں کپڑوں کا دھیان جاں فرسا
نہ ہوں بچے اگر تو اس کا غم | ہوئے بچے تو اور بھی ایذا
ناتواں ہے کوئی تو روگی ہے | سب کی تعلیم کا الگ جھگڑا
ساتھ والوں میں سب کی دلجوئی | نفس کو بات بات کی پروا
گھر پڑا اگر مرمت اس کی ضرور | لائیے جس طرح بنے پیسا
پھر غضب یہ کہ ہوں ٹیکس منضبط | دھنیاں اور کواڑ اور کھمبا
قرض خواہوں کا ایک سمت ہجوم | اُن کی وہ شدتیں پنہ بخدا
ہاتھ میں ہے معاش تھوڑی سی | وقت پر اس سے کچھ نہیں آتا
سر پہ مشتعلیں کا کٹڑی کی الگ | چاہے پیدا ہو یا نہ ہو پیدا

دشت سنسان اور اندھیرا گھپ — کوئی رہبر نہ روشنی نہ عصا
اک طرف شیر اک طرف افعی — اک طرف کوہ اک طرف دریا
کوہ کی راہ ہر طرف مسدود — شور طوفاں سے منقلب دریا
اس پہ آنکھوں میں باندھ کر پٹی — ہمکو حکم سفر تنِ تنہا
ہائے کیوں آپ کھا گئے گیہوں — اس میں کمبخت کیا دھرا تھا مزا
عقل والی کہاں کی ایسی تھیں — یہی حضرت ہماری ماں حوّا
ان کے کہنے کو آپ مان گئے — کاش کچھ سوچ بھی لیا ہوتا
میری باتیں تھیں سب ٹھکانے کی — ہنس کے بولے کہ صبر کر بیٹا
زندگی کو کتاب تم سمجھو — تم ہو طالب تو مدرسہ دنیا
مجھ سے جتنا گلہ کیا تم نے — یہ سبق بھولنے کی سب ہے سزا
جی چرانے نہیں ہیں طالب علم — پہنچے مکتب میں گر کوئی ایذا
کہیں ڈگر بڑ تم نہ ہو جاؤ — گر یہی ہمتوں کا ہے نقشا
پاس کر لو کئی کلاسوں کو — ہوں اگر سختیاں تو کیا پروا
پاس کر کے جو یاں سے نکلو گے — سارے دکھ درد پھر تو خود ہیں ہوا
پھر یہ کھیتی بتاؤ کب ہوتی — میں ہی گیہوں اگر نہ کھا جاتا
آؤ جھک جاؤ پیار تو کر لوں — پھر نہ مکتب کا کیجیو شکوا

باخرد ہو سمجھ کے بات کرو

بند رکھو زبان کو بابا

پٹنہ کے اگلے شرفا

بھرا ہوا تھا شریفوں سے شہر یوں سارا
کہ جیسے قطرۂ باراں سے ابر دریا بار

وہ صورتیں متبرک وہ اُن کی شان و شکوہ
مہذبانہ وہ باتیں وہ جاں فزا گفتار

وہ اُن کی وضع متیں اور لباس نورانی
وہ اُن کے عزم درست اور جچی تُلی رفتار

وہ کان دار کلاہ آستین قبا کی فراخ
وہ اُن کے گھیتلے جوتے وہ پائینچے بردار

ہر اک کو وضع کا پاس اپنے دوستوں کا لحاظ
لبوں پہ خُلق کی باتیں دلوں میں صبر و قرار

کسی کو نثر کا ذوق اور کسی کو نظم کا شوق
فقیہ و صاحب تقویٰ و کاسب و ابرار

وہ دوستوں سے عزیزوں کی طرح مِل جانا
بُرائیوں سے کنارہ شکایتوں سے عار

سُنو غریبوں کی حالت امیر تو ہیں امیر
مجال کیا جو کریں اپنے حال کا اظہار

نہ نکلیں گھر سے جو نکلیں تو شان سے نکلیں
کہ اپنے ہاتھ سے جانے نہ پائے اپنا وقار

بشاشتیں وہی مُنہ پر ہزار ہو تکلیف
طلب کا نام نہ لائیں زبان پر زنہار

لیے دیے ہوئے اور آبرو بنائے ہوئے
کہ تا نہ سمجھے کوئی اُن کو مفلس و نادار

مہذب ایسے تھے جاہل بھی اس زمانہ کے
کہ اہلِ علم میں کر لے زمانہ اُن کو شمار

محاوروں میں وہ شیرینیاں کہ اصلِ علی
وہ جب کریں تو بہ آہستگی کریں گفتار

نہ بات بات پہ قسمیں نہ قہقہے بے وجہ
متین وہ لب و لہجہ وہ مختصر باتیں
جھکائے سر کو شرافت سے راستہ چلنا
کریں غریب کا بھی تا بہ فرش استقبال
نشست اُن کی دوزانو کنارہ تکیوں سے
لحاظ بھائیوں تک میں بھی باپ بیٹوں کا
ہر اک کو حفظ مراتب میں تکملہ حاصل
بہادرانہ اُمنگیں سپاہیانہ شوق
کوئی جگہ کوئی صحبت نہیں کہ ہوں نہ وہاں

نہ وہ کلام کہ سُن کر عقیل ہوں بیزار
فضول گو نہ تعلق سے اپنی کچھ سروکار
ادب سے ہاتھ اُٹھانا سلام کو ہر بار
بہت لحاظ کہ آئے نہ اس کے دل پہ غبار
معاشرت سے عیاں انضباط و صبر و قرار
یہ کیا مجال کہ مرکز سے بڑھ کے ہو گفتار
ہر اک سے جھک کے تعارف صغار ہوں کہ کبار
جریب دست مبارک میں اور کمر میں کٹار
مؤرخ و شعراء ادیب و نثر نگار

صبر علی البلا

محنت سرائے عشق میں اے دوست کیا نہیں — ایذا نہیں کہ سر پہ ہجومِ بلا نہیں
کہہ دو یہ قیس سے کہ شکایت روا نہیں — لیلیٰ کا فعل لائقِ چون و چرا نہیں

رو رو کے خود کو موردِ خواری بنائے گا
کملی بھگو کے اور بھی بھاری بنائے گا

وصفِ زبان

(از سرور جہان آبادی)

ترے نطق میں ہی عجب جاں فزائی شکستہ دلوں کو ہی تو مومیائی
بھری تجھ میں ہی کوٹ کر دلربائی تری ہر ادا میں ہی رنگیں ادائی
وہ جادو بیاں نطق کی تو دلہن ہے
کہ لٹ تیرے گیسو کی زلفِ سخن ہے

جواہر کی لڑیاں ہیں فقرے مسلسل کہ ہی تو فصاحت کی گردن کی ہیکل
ستم! تیری شوخی غضب! تیری چل بل مگر ہی کسی بت کے پاؤں کی چھاگل
تکلم کے گھنگرو بجاتی ہے چھم چھم
کہ تو ناطقہ کو نچاتی ہے چھم چھم

پپیہا کبھی بن کے تو بولتی ہے کبھی بن کے طوطی شکر گھولتی ہی
ہر اک رازِ سربستہ کو کھولتی ہے کہ کانٹے میں پھولوں کو تو تولتی ہی
سخن سنج ہی تیری میزانِ دانش
ترا نطق ہے جوہرِ کانِ دانش

بنایا عجب تیرا قدرت نے پیکر مَلا نطق کا روغنِ غازہ مُنہ پر
کیا نظم نے زیبِ سر لاکے جھومر پنہایا تجھے نثر نے اپنا زیور

بلاغت نے ہاتھوں میں مہندی لگائی
فصاحت نے زلفِ معنبر بنائی

دہن میں جو تو بن کے تقریر آئی — ترے ساتھ لفظوں کی تاثیر آئی
لیے حُسن معنی کی تنویر آئی — کہ تو نطق کی بن کے تصویر آئی

بجاتی ہوئی ارگنِ نطق آئی
اُڑاتی ہوئی توسنِ نطق آئی

وہ دلچسپ نیچر کا چھیڑا ترانہ — کہ غش ہو گیا جس کو سُنکر زمانہ
کیا نطق نے تیرے گیسو میں شانہ — کہ تھی وضع تیری عجب شاہدانہ

تجھے قال نے اپنے سانچے میں ڈھالا
رنگیلی! غضب تو نے جوبن نکالا

فصاحت کے پھولوں کی او گہنے والی — تکلم کے پردے میں او رہنے والی
کسی کی کڑی تو نہیں سہنے والی — کہ ہے ایک کی منہ پہ دس کہنے والی

نہیں تجھکو صولت پناہوں کی ہیبت
کہ غالب نہیں تجھپہ شاہوں کی ہیبت

سناں ہو کہ نیزہ - چھری ہو کہ خنجر — زرہ ہو کہ بکتر ہو - یا خود و مغفر
ہو اورنگ و دیہیم - یا تاج و افسر — ہیں تیرے لیے اے زباں سب برابر

وہ آزاد رو ہے کہ رُکتی نہیں تو

وہ سر ہے - دَرِ شہ پہ جُھکتی نہیں تو

جو شیلے جوانوں کو لڑوانے والی
اکھاڑے میں شیروں سے بِھڑ جانے والی
سواروں کے نیزوں کو چمکانے والی
شجاعت کے شعلوں کو بھڑکانے والی

جو تو بڑھ کے گرجے کے سُناتی ہے رن میں
دلیروں کی ہمت بڑھاتی ہے رن میں

بندھاتی ہے تو رانڈ بیوؤں کی ہمّت
یتیموں سے کرتی ہے اظہارِ شفقت
مریضوں کو دیتی ہے تسکینِ صحّت
کہ ہے تیرے لب کی مفرّح حلاوت

ترے ہونٹ ہیں نوش دار وئے سادہ
مقوّی ہیں یاقوتیوں سے زیادہ

کہیں شہد ہے تو کہیں قند ہے تو
مواعظ کہیں ہے - کہیں پند ہے تو
دہن میں نظر بند ہر چند ہے تو
مگر وقت تقریر کب بند ہے تو

روانی میں ہے سیل - چلنے میں صرصر
چھلاوہ ہے شوخی میں - تیزی میں خنجر

عیاں ہیں ترے نکتہ سنجوں پہ جوہر
کہ ہے تو بشر کے فضایل کا زیور
ہر اقلیم میں ہے ترا سکّہ زر
کہ زیر نگیں ہے ترے ہفت کشور

چمک تیری ہر تاج و دیہیم میں ہے
نئی شاہزادی ہر اقلیم میں ہے

جو نوائے زبانِ ایشیا کی پری ہے
تو یورپ کی لیڈی شرارت بھری ہے
کہیں پہلوی ہے۔ کہیں نوری ہے
سخن کے حدیقہ کی کبکِ دری ہے

کہیں تو ہی بھاشا۔ کہیں فارسی تو
کہ ہے شاہدِ نطق کی آرسی تو

ترانہ کہیں تو ہی مطرب کے لب پر
کہیں تو ہی جادو بیانوں کے پیکر
کہیں بذلہ گو ہے۔ کہیں پند گستر
کہیں طوطیٔ شکرستان پیکر

زمانہ ہے شیدا ترا اور رنگیلی!
ادا ہے رسیلی۔ صدا ہے سُریلی



گھوڑے کی تعریف

(از حضرت میر انیس)

آہو کی آنکھ۔ شیر کی چتون غضب کی چال
وہ بال تھے کہ حور نے بکھرا دیئے تھے بال
گردن کے خم کو دیکھ کے ہو سرنگوں ہلال
پوچھے کوئی سوار سے شائستگی کا حال

اُڑ کر زمیں تلک کبھی گرد قدم گئی
جب بس کہا۔ چمکتی ہوئی برق تھم گئی

جرأت میں رشکِ شیر۔ تو ہیکل میں ہیل تن | پوئی کے وقت کبکِ دری جست میں ہرن
بجلی کسی جگہ۔ تو کہیں ابرِ قطرہ زن | بن بن کے آنے جانے میں طاؤس کا چلن

سیماب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا
دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

پیکاں ہیں پاکنوتیاں ہنگامِ دار و گیر | حلقے سے یوں نکلتا ہے جیسے کماں سے تیر
رُو میں وہ نرم۔ جلد وہ بار یابِ بے نظیر | جیسی پرند جس سے مقابل نہ ہو حریر

(ایک قسم کا ریشمی کپڑا ہے)
ایسی سبک روی نہیں دیکھی شتاب میں
دوڑے تو فرق آئے نہ مخمل کے خواب میں

وہ گشت اور اُس کے طرارے وہ آؤ جاؤ | پانی پہ گر حباب تو آبِ رواں میں ناؤ
گھونگھٹ میں دیکھ پائے اگر چال کا بناؤ | دولھا کے دل میں پھر نہ رہے کچھ دلہن کی چاؤ

دعویٰ غلط خرام میں کبکِ دری کا ہے
اس بادپا کے سایہ میں جلوہ پری کا ہے

خوش خو و خوش خرام و خوش اندام و خوش لگام | خوشرو و خوش جمال و ادا فہم و تیز گام
جاندار و شوخ چشم و سعید و خجستہ کام | گل پوش و تیز ہوش سمن گوش و لالہ فام

غازی تھا۔ سرفراز تھا۔ عالی دماغ تھا
گویا ہوا کے دوش پہ اک زندہ باغ تھا

چالاکیاں بھی غیظ بھی غربت بھی جنگ بھی | بالا دوی براق کی دُلدل کا ڈھنگ بھی

بر میں اسد بھی - بحر و غا میں نہنگ بھی ‏ گھوڑا بھی شبدیز بھی - ہرن بھی پلنگ بھی

ہی آگ کا مزاج تو سرعت ہوا کی ہے

اضداد اتنے جمع ہیں قدرت خدا کی ہے

کوہی ہے وہ تندرو ہی کیا اسکی چال کیا ‏ طاؤس کیا ہمارے سعادت خصال کیا

کیا پایک عقل شاطرِ وہم و خیال کیا ‏ اس کے قدم کی گرد کو پہنچے مجال کیا

دیکھی نہیں کسی نے یہ چھل بل سمند ہیں

پارہ بھرا ہوا ہی ہر اک جوڑ بند ہیں

شاہ دکن کی تعریف

(از فصیح الملک داغ دہلوی)

شاہ عادل شاہ باذل مہربان و قہربان ‏ ÷ ‏ برمحل ہی لطف اسکا برمحل ہی اسکا قہر

کیا دکن کیا ہند دونوں کی ہی خلقت فیضیاب ‏ ÷ ‏ شاہ آصف جاہ کی دولت سے ہی ساری لہر

اُمید

(از کلام حضرت بیان یزدانی مرحوم)

زمانہ اگر صحن باغِ ارم ہے ‏ تو تو اے امید اس کی ابرِ کرم ہے

شگوفوں میں چھپتی ہے تو مسکرا کر — تو ہی کھل کھلاتی ہے پھولوں میں آ کر
تمنّا کے کھیتوں میں ہلچل ہے تیری — تمدن کے میداں میں چھل بل ہے تیری
تو ہی ہاں کے پودوں میں دیتی ہے پانی — ہرا تجھ سے ہے گلشنِ زندگانی
شگوفوں کے کوچوں میں تو دوڑتی ہے — یہ تو دوڑتی ہے کہ بُو دوڑتی ہے
ترے سر پہ تاجِ شہی سج رہا ہے — ترے در پہ کوسِ شہی بج رہا ہے
چڑھی تو مخالف پہ لشکر کو لیکر — پھری باج لیکر چلی تاج لیکر
دیا تو نے سلطاں کو خلعت سُنہرا — ہوا میں تری اُڑ رہا ہے پھریرا
تو ہی ہے جوانوں کے گھوڑوں کی کاٹھی — تو ہی ہے ضعیفوں کے ہاتھوں کی لاٹھی
اُٹھایا اپاہج کو بستر سے تو نے — جلایا ہے مُردوں کو ٹھوکر سے تو نے
جگاتی ہے چھینٹوں سے تو غافلوں کو — اُٹھاتی ہے شوخی سے تو کاہلوں کو
رگوں میں لہو بن کے تو دوڑتی ہے — ترے ساتھ ساتھ آرزو دوڑتی ہے
تو ہی ڈوبتی ناؤ کا ہے کنارا — تو ہی دیتی ہے ڈوبتے کو سہارا
سمندر میں نلسن کو لیکر گئی تو — ولنگٹن کو میدان لیکر چڑھی تو

کولمبس کو تیری ہی لہر آ رہی تھی
ڈگاما کی آنکھوں میں لہرا رہی تھی



معرفت الٰہی

(از حضرت انیس)

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو
آنکھیں جنھیں ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو
نزدیک رگِ جاں سے ہے اس پر یہ بعد
اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

قبر

مر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے
رخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر
میں نے بھی تو جان دے کے پایا ہے تجھے

قدرت باری تعالےٰ

ہر برگ سے قدرت احد پیدا ہے
ہر پھول سے صنعت صمد پیدا ہے
سینہ ہے بشر کا وہ محیطِ ذخّار
ہر ایک نفس سے جزر و مد پیدا ہے

سخن جان ہے

انسان ذی عقل وہوش ہو جاتا ہے
اور صاحب چشم و گوش ہو جاتا ہے
گر جان نہیں سخن تو بتلایئے پھر
کیوں مر کے بشر خموش ہو جاتا ہے

معرفت خدا

گلشن میں پھروں کہ سیر دریا دیکھوں
یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر سو تری صنعتیں ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

رحمت باری

ماں باپ سے بھی سوا ہے شفقت تیری
افزوں ہے ترے غضب سے رحمت تیری
جنت انعام کر کہ دوزخ میں جلا
وہ رحم ترا ہے یہ عدالت تیری

دادِ سخن

نافہم سے کب دادِ سخن لیتے ہیں
دشمن ہو کہ دوست سب کی سن لیتے ہیں
چھپتی نہیں بوے دوستاں یکرنگ
کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتے ہیں

موت

اے گرم خبر موت کے آنے کی ہے
ناداں تجھے فکر اب وداع کی ہے
ہستی کے لیے فکر دو اک دن ہو تنا
آنا تیرا دلیل جانے کی ہے

فروتنی

رتبہ جسے دیتا ہے خدا دیتا ہے
وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے

کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

شیریں کلامی

نہ مدح کا دعویٰ ہے نہ خود بینی ہے
باتوں میں اثر زباں میں نمکینی ہے
شیرینی میں ہے نمک حلاوت دیکھو
ہے طرفہ مزا نمک میں شیرینی ہے

مشک آنست کہ خود ببوید

کس منہ سے کہوں لائقِ تحسین ہوں میں
کیا لطف جو گل کہے کہ رنگیں ہوں میں
ہوتی ہے حلاوتِ سخن خود ظاہر
کہتی ہے کہیں شکر کہ شیریں ہوں میں

ہر سال عمر بڑھتی نہیں بلکہ گھٹتی ہے

دل سے طاقت بدن سے کس جاتا ہے
آتا نہیں پھر کے جو نفس جاتا ہے
جب سال گرہ ہوئی تو عقدہ یہ کھلا
یاں اور گرہ سے ایک برس جاتا ہے

زمزمۂ قیصری

(از شمس العلماء مولانا حالی)

اے حصارِ عافیت اے کشورِ ہندوستاں
زیب دیتا ہے اگر کہیے تجھے سارا جہاں
اک طرف کھینچی ہے قدرت نے تری دیوارِ کوہ
موج زن ہے ایک جانب تیرے بحرِ بیکراں
چوٹیوں پر ہے پہاڑوں کی وہ عالم برف کا
ہے سدا چھایا ہوا جس پر خموشی کا سماں
بحر میں ہوتا ہے اک شورِ قیامت آشکار
جبکہ اُس میں آ کے گرتی ہیں ہزاروں ندیاں
خوف باہر کا ہے تجھکو اور نہ کچھ اندر کا فکر
(دستِ گلچیں نارسا و نخل و دولت گل فشاں)
تو نے فارغ کر دیا ہے فتحِ ملکِ غیر سے
پھر ضرورت کیا کہ کھولیں بے سبب تیر افشاں

چل رہی ہے امن کی ہر سو ہوائے خوشگوار
(ہو نہ اب کہدو خزاں سے رخنہ اندازِ بہار)

ہند کا حق تھا کہ ہوتی مہر و الفت کی زمیں
قوم کے ہمدرد ہوتے اس مکاں کے سب مکیں
حیف جس مٹی سے اُگنا چاہیے تھا نخلِ مہر
جم گیا آب و ہوائے دہر سے واں تخمِ کیں
سر بسر نکلے گلِ خود رو کے جس جنگل میں تھے
(غور سے دیکھا تو) یہاں تھے درندے بھی وہیں
(امن قائم تھا طلوعِ صبح کے آغاز میں
جتنا دن چڑھتا گیا ہوتا گیا غفلت گزیں)
دیوتا جو آریا کے زعم میں فانی نہ تھے
فانیوں کی طرح یہاں آ کر رہے وہ بالیقیں[لہ]

لہ یہ شعر اپنی طرف سے اس لیے بڑھا دیا گیا ہے تاکہ بند کے پورے سات شعر ہو جائیں ۱۲ حالی

جنگ و خونریزی کے خود آکر ہوئے وہ رہنما ۔۔۔ ورنہ فتنہ کا قدم تک یہاں نہ آیا تھا کہیں

یک بیک آیا خلل امن و اماں میں ہر طرف
اک تزلزل پڑ گیا ہندوستاں میں ہر طرف

مرحبا ای خطۂ ہندوستاں (صد مرحبا) ۔۔۔ اس خرابی پہ بھی روکے تو نے حملے بارہا
جانتا ہی اک جہاں اسکندرِ اعظم کا نام ۔۔۔ چشمۂ حیواں پہ جسکو لے گیا بختِ رسا
تھا جہاں خوف اور سناٹا بشر کا سدِّ راہ ۔۔۔ اور بیچر کے طلسموں میں خلل آیا نہ تھا
گہرے اور تاریک غاروں میں تھا آبِ زندگی ۔۔۔ سایۂ ہیبت تھا جن پر سر بسر چھایا ہوا
گو ہوئی اُس کی رسائی چشمۂ حیواں تلک ۔۔۔ پر نہ ہرگز تیرے سارے مرحلے طے کرسکا
جی میں جو حسرت تھی وہ آخر نہ نکلی زینہار ۔۔۔ (دلمیں جو ارمان تھا وہ دل کا دل ہی میں رہا)

وقت نے فتح کی بے طرح گھبرایا اُسے
کام ہی مشکل تھا یا مشکل نظر آیا اُسے

راگنی اب وقت کی ہم چھیڑتے ہیں برملا ۔۔۔ جس سے ظاہر ہو کہ حالت ہند کی ہی آج کیا
اتفاق اور دوستی نے کر دیا ہی سب کو ایک ۔۔۔ اور آزادی[۵] نے کر رکھا ہی ہر اک کو جدا
مملکت فوجوں سے اور قلعوں سے ہی معمور سب ۔۔۔ پایۂ نظم و نسق پہنچا ہے تا فوق السما

۵ یعنی سب کو رائے کی آزادی حاصل ہی۔ ہر شخص ایک دوسرے کے اور خود گورنمنٹ کے خلاف رائے دینے کا مجاز ہے گویا آزادی کی حیثیت سے جدا جدا ہیں اور اتفاق کی حیثیت سے سب ایک ہیں ۱۲

سر پہ دو تاج ہمایوں ہند کے رکھے گئے
واجبی حق الغرض مدت کے بعد اسکو ملا

برخلاف اُس ملک کے جو ڈھک رہا ہی برف سے
ہر طرف سے بن ہی بن اور قحط ہی جاندار کا

ق

بھیڑیوں کے غول پھرتے ہیں بنوں میں چیر کے
تاکہ جو ملجائے وہاں آوارہ دشتِ بلا

۲

کر کے چھوڑیں اُس کو ایسا بیکس و بے خانماں
حشر تک پیارے رہیں فرقت میں اُسکی نوحہ خواں

بارے ایسی ہند کی حالت نہیں زار و نزار
ہی موافق اُس کی وسعت کے رعیت کا شمار

فرض کیجے کل بنی آدم کے چھ حصے اگر
ایک حصہ اُس میں اہلِ ہند پائیں گے قرار

ہی یقیں مقدار اسکی اُس سے بھی بڑھ جائے کچھ
کیونکہ فتنہ کو نہیں مدت سے ملتا اُسمیں بار

زندگی کی ریت اب ٹھہرگی شیشے میں سوا
پیشتر جس کے نکلنے کا بندھا رہتا تھا تار

اس قدر بندوں کی روزی کا ہمیں کیوں فکر ہو
ہی خدا کے حکم پر سب کی معیشت کا مدار

کچھ نہیں تو قحط کا دورہ سلامت چاہیے
بڑھنے پائیگا نہ آدم زاد کا حد سے شمار

یاد رکھ اے منکرِ حق - ہی یقیں اصلِ نجات
وسوسوں سے اور کھل جاتی ہی راہِ مشکلات

۱؎ یہ روس کے ویران اور غیر آباد ملک کی طرف اشارہ ہی ۱۲

۲؎ اس خیال سے مترشح ہوتا ہے کہ شاعر کے نزدیک غریب ہندوستانیوں کی جانیں خزانے دمن و حشرات الارض سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں - کاش وہ ہندوستان کی آبادی گھٹنے کے لیے یہ امید (بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر دیکھو)

مملکت اتنی ہو جس کی اور وسعت اسقدر — ہو زمیں ساری خدا کی برکتوں سے بہرہ ور

ایسے سلطانِ بلند اقبالِ فرخ فال کو — اور پھر کیا چاہیے۔ کچھ بھی قناعت ہو اگر

ہے کوئی وادی جہاں میں ہمسرِ کشمیر آج — یا کوئی گنگا کے میداں سے۔ زمیں زرخیز تر

شہر ہے جو مرکزِ کشمیر[۵] مانندِ طلسم — طرفہ کیفیت سے ہے لہروں میں ڈل کی جلوہ گر

دیکھتے ہیں آبِ صافی میں جب اُس کا انعکاس — دوسرا اوینس کا نقشہ صاف آتا ہے نظر

باغِ شالامار۔ جو رونق فزا ہے اُس کے پاس — ہے وہ اک نیرنگ قدرت کا تماشا سربسر

سبزہ و نسرین و گل کی سرزمیں کہیے اُسے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۸ - ظاہر کرتا ہے کہ جس قدر تجارت سیاحت اور علوم و فنون کی ملک میں ترقی ہوتی جائے اُسی قدر یہاں کے باشندے ترک وطن اختیار کرتے جائیں گے اور اسی طرح رفتہ رفتہ ملک کے باشندوں کی تعداد ایک مناسب مقدار پر ٹھہرے گی - اس بیان میں ایک اور بھی خلل ہے - اوپر کے شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کی مردم شماری زیادہ ہونے سے اس بات کا اندیشہ ہے کہ ہندوستان کی پیداوار ہندوستانیوں کی خوراک کے لیے کافی نہ ہو اور اس سبب سے بہت سے لوگ بھوک کے مرنے لگیں اس اندیشہ کو وہ اس طرح رفع کرتا ہے کہ جب قحط سالیوں میں لوگ بھوکے مرتے رہیں گے تو مردم شماری بڑھنے نہ پائے گی اور ملک کی پیداوار ملک والوں کو کافی ہو گی گویا بھوک سے مرنے کا علاج بھوک ہی سے مرنا بتاتا ہے - ۱۲

۵ مرکز کشمیر سے مراد شہر سری نگر ہے ۱۲

صفحۂ گیتی پہ یا خلدِ بریں کہیے اُسے

فی المثل تختۂ زمرد کا ہی وہاں اک سبزہ زار ۔۔۔ سایہ افگن اس طرح ہیں ہو بہو اُس پہ چنار
جھیل کے چاروں طرف جس طرح آتے ہیں نظر ۔۔۔ زیر و بالا اونچے نیچے گھر قطار اندر قطار ۲
تھی بنانے سے غرض تیرے یہ ای باغِ نسیم ۔۔۔ باغِ جنت کا نہ انساں کو رہے کچھ انتظار
چوٹیاں جو پربت کی ہیں برف میں لپٹی ہوئیں ۔۔۔ جا بجا گویا کھڑے ہیں دیو اور جن پہرہ دار
اُن کی رفعت اور بلندی کی نہیں کچھ انتہا ۔۔۔ سینۂ گردوں سے گویا اب نکل جائیں گے پار
روز روشن میں جب اُن کا جھیل پر پڑتا ہی عکس ۔۔۔ نقرئی پانی کی اُس کی پھر کوئی دیکھے بہار

اور پھر جھرمٹ زنانِ مہ لقا کا ہر طرف
سامنا آفت کا فتنہ کا بلا کا ہر طرف

جنت ای کشمیر کوئی تجھ سی دنیا میں نہیں ۔۔۔ تو نہیں دیتا بھٹکنے اپنے طالب کو کہیں
ہر چمن یاں پھول سے اور پھل سے مالا مال ہے ۔۔۔ ہر چمن میں ہیاں مہیا ہیں مکاں بہر مکیں
اُن مکانوں اور خیابانوں سے جب آگے بڑھے ۔۔۔ پھر وہ عالم ہی جہاں غیر از خموشی کچھ نہیں
جیسے ہوتا ہی ابد پر وقت جا کر منتہی ۔۔۔ ختم ہو جاتی ہے دنیا بھی یہاں آ کر یونہیں
یعنی اقلیم ابد اور یہ جہانِ خامشی ۔۔۔ طاقتِ انساں کی حد سے ہیں پرے دونوں کہیں
طُرفہ سنّاٹا ہی اس سنسان کوہستان پہ ۔۔۔ جس کی دنیا میں نہیں تمثیل کوئی دلنشیں

ہیں سراسر ناپدید آثارِ انسانی یہاں
مُنہ لپیٹے ہیں پڑے اسرارِ یزدانی یہاں

ڈھونڈھیے گر اِن پہاڑوں کی بلندی کی مثال ‏ ظاہر اُنکا اور انگلستان کا ہے ایک حال
جیسے وادی کی زمیں سے تا فلک پہنچے ہیں یہ ‏ وہ بھی پستی سے یونہیں پہنچا ہے تا اوجِ کمال
ہے یقیں سنتے رہی ہیں ہو چکا کام اُن کا تمام ‏ ہو جنھیں اُسکی بلندی تک پہنچنے کا خیال
تا پتی پر آکے انگریزوں نے جب کھولی دُکاں ‏ ایک مدت تک ترقی نے نہ بدلی اپنی چال
یعنی اُس دم تک کہ سکھوں سے ہوا اگر اگاڑ ‏ ق ‏ اور دریا ہو گئے پنجاب کے سب خوں میں لال
لشکرِ مقدونیہ کی قتل گاہوں پر ہوا ‏ ۲ ‏ بعد مدت گرم پھر ہنگامۂ جنگ و جدال

اہلِ انگلستان کو جھگڑوں سے فرصت کم ملی
امن کو فتنہ کے ہاتھوں سے فراغت کم ملی

جب بغاوت نے اُٹھایا سر تو اُس سے بھی سوا ‏ آگ بھڑکی مرگ کی اور خون کا دریا بہا
عورتیں اور اُن کے بچے بے گنہ مارے گئے ‏ گھر جلے اور دشمنِ جاں ہو گئے خود دست و پا
بھائی بندوں کی جفائیں دیکھکر غمگیں ہوئے ‏ اہلِ انگلستاں کے ساتھی تھے جو اہلِ وفا
اور ہزاروں نے یہ باندھا ملکے منصوبہ کہ بس ‏ عزتِ انگلستان کی اب خاک میں دیجے ملا
صفحۂ ہستی سے نام اُن کا مٹانے کے لیے ‏ ہو گیا تیار جان و دل سے ہر چھوٹا بڑا
لیکن اُن کی گھات میں تھا شحنۂ قہر و غضب ‏ پھنس گئے پنجہ میں اُس کے یک بیک اہلِ خطا

پلہ انگلستان کا ہو کر رہا آخر گراں
گرتے گرتے تھم گیا اقبال کا اُس کے نشاں

گو ہوئی دلّی پہ حاصل پھر ملا فتح و ظفر ‏ پرچمِ اقبال لہرانے لگا پھر بے خطر

پر نہ اس فتحِ نمایاں کا ہوا اعلان کچھ
وسوسوں سے دل رہا ہے سب اسی لیے زیر و زبر

چونک چونک اُٹھنے لگے راتوں کو بدخوابی لوگ
کر گئی دنیا سے گویا فارغ البالی سفر

صبح کے ہوتے ہی سب کافور ہو جاتی تھیں وہ
شکلیں ہیبت ناک جو راتوں کو آتی تھیں نظر

رائے یہ ٹھہری کہ پائے اب وہ قیصر کا لقب
تابعِ فرماں ہیں جس فرماں روا کے بحر و بر

قوّتِ بازو سے جو حاصل کیا ہے قوم نے
وہ ہمایوں تاج رکھا جائے اُس کے فرق پر

تاکہ سب جانیں کہ رخصت ہند سے فتنہ ہوا
عہد انگلستان کا جو کچھ کہ تھا پورا ہوا

اس نوید روح پرور کی اشاعت کے لیے
ہند میں آیا پرنس آف ویلز انگلستان سے

البرٹ اڈورڈ جس کے دودۂ اقبال میں
سو جلیل القدر سلطاں اب سے پہلے ہو چکے

جس کے دادا نے کیا زیر و زبر نظمِ فرانس
اور بتاتا ہے لقب جس کا پتے اُس جنگ کے

دی فرانسیسوں کو جس میں زک وہ انگلستان نے
جس سے واقف ہیں فرنگستان کے چھوٹے بڑے

حاکمِ بوہیمیا کی چھین لی تھی جس میں ڈھال
خود ولیعہدِ زماں نے یاریِ اقبال سے

جس پہ کلمے اعترافِ بندگی کے بر ملا
حاکمِ بوہیمیا کے دستخط سے ثبت تھے

جمع تھے جس ذاتِ والا میں فضائل اس قدر
وہ ہوا مامور اس کارِ عظیم الشان پر

وہ مبارک وقت جب لنکا سے لیکر تا عدن
اُس کے آنے کی خوشی میں محو تھے سب مرد و زن

راگ گائے جاتے تھے ہر سو مبارکباد کے
جوشِ شادی میں در و دیوار تک تھے نغمہ زن

شہر میں جنگل میں ہر میدان میں ہر راہ میں — جمع تھی اُس کے لیے خلقِ انجمن در انجمن
وہ سہانے بول شہنا کے وہ باجوں کی جھڑی — پڑ رہی ہے جشن کی گویا کان میں اسباب بھرن
کھچ چکے ہیں اُس ہمایوں جشن کے نقشے بہت — میں بھی اب وکٹوریا ای فخرِ شاہانِ زمن
چاہتا ہوں کھینچنا خاکا اک اُس دربار کا — جس میں کی تو نے قبائے قیصری زیبِ بدن

جس میں تیرے نام کا ڈنکا بجایا قوم نے
جو کہا تھا منھ سے آخر کو دکھایا قوم نے

غمِ شبلی و ماتمِ حالی

(از احسن مارہروی)

رخصت ای صبر! کہ بس جبر کی اب تاب نہیں — طمعِ عیش نہیں آرزوئے خواب نہیں
جمع کیا کیا غم و اندوہ کے اسباب نہیں — دلِ مضطر نہیں یا دیدۂ خوں ناب نہیں

خانۂ عیش میں بربادی و ویرانی ہے
آج مجموعۂ خاطر کی پریشانی ہے

کوئی سامان فراغت نہیں حسبِ دلخواہ — گھر ہی ویران تو گھر والے ہیں برباد و تباہ
اس طرف ملک میں ہے قحط و با شام و پگاہ — اُس طرف قوم میں فقدانِ کمال آہ صد آہ

جب سے خوش بختی و اقبال نے منھ پھیرا ہے

ہر طرف سے غم و ادبار نے آ گھیرا ہے

آج سے چند صدی قبل کی سُنئے حالت
نہ یہ ادبار کا نقشا تھا نہ غم کی صورت

کال تھا رنج کا تھی عیش کی بڑھتی دولت
اور پھر علم و کمالات کی شان و شوکت

کوئی مفلس نظر آتا تھا نہ جاہل کوئی
تھا نہ اُس عہد کا بے فکر بھی کاہل کوئی

فارغ البال تھے اس عہد میں سب اہل کمال
آب و خور کی نہ گرانی تھی نہ تھا قحط رجال

جس کو دیکھو نظر آتا تھا نہایت خوشحال
عیش و عشرت کے سوا پاس نہ تھا رنج و ملال

باکمالوں کی یہ کثرت تھی زمانے بھر میں
جمع ہو جاتے تھے دس دس کبھی ایک ایک گھر میں

اکبری عہد کی تاریخ ہی دیکھیں ہم اگر
سیکڑوں آئیں نظر اہل کمال اہل ہنر

ہیں کہ اُس وقت میں ثانی نہ تھا کوئی ہمسر
فرد فرد اپنے کمالات میں تھی نام آور

دھوم تھی ہند سے ایران و عرب تک سب کی
جب تو ہے عزت و توقیر ہی اب تک سب کی

ملک بھر کے کملا کا تو ہے دشوار شمار
ایک کوزے میں سماتا نہیں بحرِ ذخّار

ہے مناسب کہ نمونے کے لیے ہوں اظہار
صرف وہ نام جو تھے زینتِ شاہی دربار

صورتِ ترجمہ اسلاف کی تحریریں ہیں
اکبر و عہدِ جہاں گیر کی تصویریں ہیں

خانِ خاناں[1] و ابوالفضل[2] و ضمیری[3] عرفی[4] دکنی خواجہ خداوند[5] و صبوحی[6] فیضی[7]

میرزا جعفر[8] و ہمام[9] و محمد بختی[10] ملکِ قمی[11] و ملائے حسینِ[12] نقشی

میر فتح اللہ[13] شیرازی و قاضیِ کمال[14]

حاجیِ افضل[15] و مشکیں رقم[16] و شیخ جلال[17]

طالبِ آملی[18] و شیخ سلیمِ چشتی[19] حافظ رخنہ[20] و نور اللہ[21] و قاسم[22] علوی[23]

نورِ دیں[24] شیخ مبارک[25]، شہ عارف[26] نامی شمسِ دیں[27]، خانِ زماں[28]، یوسف[29] و ملا طاری[30]

حضرتِ غوث[31] و ضیاء اللہ[32] و عبدالقادر[33]

مشہدی[34]، کوکہ[35]، ابوالفتح[36]، رفیع[37] شاعر

---

۵۱ اکبر اور جہاں گیر کے درباریوں میں یہ خطاب تین آدمیوں کا تھا (۱) بیرم خاں جو ہمایوں کے عہد سے وابستۂ دربار تھا المتوفی ۹۶۸ھ (۲) منعم خاں پسر بیرم خاں المتوفی ۹۸۳ھ (۳) عبدالرحیم خانِ خاناں المتوفی ۱۰۳۶ھ ۵۲ شیخ ابو الفضل دربار اکبری کا مشہور علامہ المتوفی ۱۰۱۱ھ ۵۳ مولانا نظام الدین ضمیری بلگرامی المتوفی ۱۰۰۳ھ ۵۴ مولانا جمال الدین عرفی المتوفی ۱۰۲۷ھ ۵۵ خواجہ خداوند دکنی اکبری دربار کا ڈیڑھ ہزاری منصب دار المتوفی ۹۹۵ھ ۵۶ صبوحی المتوفی ۹۷۲ھ ۵۷ شیخ ابو الفضل فیضی المتوفی ۱۰۰۴ھ ۵۸ میرزا جعفر قزوینی المخاطب بہ آصف خاں وزیر جہانگیر المتوفی ۱۰۱۲ھ ۵۹ اصل نام ہمایوں تھا مگر دربار اکبری میں حکیم ہمام نام تھا المتوفی ۱۰۰۳ھ ۵۱۰ محمد بختی المتوفی ۹۹۹ھ ۵۱۱ ملکِ قمی مشہور شاعر المتوفی ۱۰۲۵ھ

(بقیہ نوٹ صفحہ آیندہ پر)

بیاگت خانِ[38] دہی و شیخ احمد[39] الف ثانی
شیخ عبد[40] النبی و شیخ گدا[41] ئی بخشی[42]
میرزا شاہ[43] رخ و عدل[44] و حکیم مصری[45]
خانِ[46] غازی و معالی[47] و رفیع[48] صفوی
ناصر[49] الملک و علائی[50] و شہ عبد[51] غفور
مرتضیٰ[52] خانِ جہاں[53] خواجہ آینا[54] منصور[55]

(سلسلہ نوٹ صفحہ ۱۶۵) ۱۲ ملا حسین نقشی مہرکن تھے المتوفی سنہ ۹۸۹ھ ۱۳ میر فتح اللہ شیرازی المتوفی سنہ ۹۹۷ھ ۱۴ قاضی ابوالفتح عرف قاضی کمال بلگرامی المتوفی سنہ ۱۰۰۰ھ ۱۵ حاجی افضل بلگرامی المتوفی سنہ ۹۸۰ھ ۱۶ میر عبداللہ ترمذی مخاطب بشکیں رقم المتوفی سنہ ۱۰۳۵ھ ۱۷ شیخ جلال المتوفی سنہ ۹۹۱ھ ۱۸ ملک الشعرا طالب آملی المتوفی سنہ ۱۰۳۵ھ ۱۹ حضرت شیخ سلیم چشتی رح مشہور بزرگ المتوفی سنہ ۹۷۹ھ ۲۰ حافظ رخنہ المتوفی سنہ ۱۰۰۰ھ ۲۱ قاضی میر نور اللہ شستری المتوفی سنہ ۱۰۱۹ھ ۲۲ سید نجم الدین نام۔ ابوالقاسم کنیت۔ کاہی تخلص۔ المتوفی سنہ ۹۸۹ھ ۲۳ شیخ وجیہہ الدین گجراتی علوی المتوفی سنہ ۹۹۸ھ ۲۴ حکیم نورالدین المتخلص بہ قراری المتوفی سنہ ۹۸۳ھ ۲۵ مبارک اللہ عرف شیخ مبارک والد فیضی و ابوالفضل المتوفی سنہ ۱۰۰۱ھ ۲۶ شاہ عارف حسینی المتوفی سنہ ۱۰۰۶ھ ۲۷ حکیم الملک شمس الدین گیلانی المتوفی سنہ ۹۹۹ھ ۲۸ امیر الامرا خانِ زماں علی قلی خاں سیستانی المتوفی سنہ ۹۰۵ھ ۲۹ محمد یوسف درباری اکبر المتوفی سنہ ۹۰۷ھ ۳۰ ملا علی محدث طاری تخلص المتوفی سنہ ۹۸۱ھ ۳۱ سید محمد غوث گوالیاری المتوفی سنہ ۹۷۰ھ ۳۲ شیخ ضیاء اللہ المتوفی سنہ ۱۰۰۵ھ ۳۳ ملا شیخ عبدالقادر بدایونی المتوفی سنہ ۱۰۰۴ھ ۳۴ ملک الشعرا مولانا غزالی مشہدی المتوفی سنہ ۹۸۰ھ (بقیہ نوٹ صفحہ آیندہ پر)

اکثر ان میں ہیں وہی نام جو تھے درباری | جن کو اکبر سے عنایت ہوئی منصب داری
اہلِ دربار کی فہرست نہیں یہ ساری | سب گنے جائیں تو ہو جائے کتاب اک بھاری

ہے فقط اسم شماری یہ نمونے کے بطور
ورنہ درباریوں کے نام ہیں باقی ابھی اور

(سلسلہ نوٹ صفحہ ۱۶۶) ۳۵؎ مرزا عزیز کوکہ المخاطب با عظم خاں المتوفی ۱۰۳۳ھ ۳۶؎ مسیح الدین حکیم ابوالفتح گیلانی برادر حکیم ہمام المتوفی ۹۹۷ھ ۳۷؎ رفیع الدین نام ۔ دکن وطن ۔ شاعر دربار اکبر المتوفی ۱۰۱۱ھ ۳۸؎ تردی بیگ خاں ترکستانی ہمایوں کے عہد سے وابستہ دربار تھے ۔ ۳۹؎ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی مشہور بزرگ المتوفی ۱۰۳۵ھ ۴۰؎ شیخ عبد النبی صدر المتوفی ۹۹۰ھ ۴۱؎ شیخ گدائی کمبوہ المتوفی ۹۷۶ھ ۴۲؎ شیخ نظام الدین احمد المتخلص بہ بخشی صاحب طبقات اکبری ۱۰۰۳ھ ۴۳؎ میرزا شاہ رخ المتوفی ۱۰۱۶ھ ۴۴؎ سید محمد میر عدل علاقہ سنبھل کے رہنے والے تھے المتوفی ۹۸۶ھ ۴۵؎ حکیم مصری دکنی شاہی طبیب ۴۶؎ قاضی نظام بدخشی مخاطب بہ غازی خاں المتوفی ۹۹۲ھ ۴۷؎ شاہ ابوالمعالی خواجگان کاشغر کے گھرانے سے تھے المتوفی ۹۷۱ھ ۴۸؎ سید رفیع الدین صفوی ہمایوں کے درباری تھے ۴۹؎ ناصر الملک ملا پیر محمد خاں اکبر کے درباری تھے ۵۰؎ شیخ علائی صوبہ بنگال کے ساکن المتوفی ۹۵۶ھ ۵۱؎ شاہ عبد الغفور عرف بابا کپور اکبری عہد کے مجذوب تھے المتوفی ۹۷۹ھ ۵۲؎ میر مرتضیٰ شریفی سید شریف جرجانی کی اولاد میں تھے ۹۶۴ھ تک زندہ تھے (بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ پر)

سب کے سب انمیں تھے نام آور وصاحب اقبال　　بدرِ کامل کوئی تھا کوئی تھا خورشید کمال

سب کے اوصاف کی تشریح ہی اک طولِ خیال　　مختصر یہ ہی انھیں سے تھا سب اکبر کا جلال

شاہ، گران میں نہ تھا کوئی تو حیرت کیا ہے

شاہ گر، جب تھے تو پھر اور حقیقت کیا ہے

اک وہ تھا عہدِ قدیم ایک یہ ہی عصرِ جدید　　جامۂ کہنہ کی یک لخت ہوی قطع و برید

نہ وہ تعلیم و تعلّم ہی نہ وہ گفت و شنید　　ہی ہر اک رنگ ہر اک بات میں گویا تجدید

ایشیائی روش و طرز کے انداز نہیں

وہ ترانے نہیں وہ دُھن نہیں وہ ساز نہیں

نہ وہ عالم نہ وہ علم اور نہ وہ شانِ تعلیم　　نہ وہ مکتب نہ وہ حافظ نہ میاں جی نہ حکیم

نہ وہ شاعر نہ وہ اشعار نہ وہ طبعِ سلیم　　مٹ گئیں صفحۂ عالم سے نقاویرِ قدیم

نہ وہ میخانہ نہ میکش ہیں نہ وہ ساقی ہی

بس اک اللہ کا ہی نام کہ وہ باقی ہے

دیکھ لی ایک صدی کی یہ ترقی یہ بہار　　اب ذرا ایک صدی کا ہو تنزّل بھی شمار

(سلسلہ نوٹ صفحہ ۶۷) بعد وفات امیر خسرو دہلوی کے جوار میں دفن ہوئے ۵۳ حسین قلی خانِ خانِ جہاں بیرم خاں خانِ خاناں کا بھانجہ المتوفی سنہ ۹۸۶ھ ۵۴ خواجہ امین الدین تبریزی مشہور خواجہ امینا مخاطب بہ خواجہ جہاں۔ المتوفی سنہ ۹۶۳ھ ۵۵ خواجہ منصور المتوفی سنہ ۹۸۹ھ (ماخوذ از دربار اکبری و مفتاح التواریخ)

تیرھویں پچھلی صدی میں جو بچے تھے دو چار — ہو گئے راہیِ فردوس مٹے سب آثار
نام اُن نامیوں کے آج سنائیں کن کو
اجنبی لوگ نظر آتے ہیں، دیکھو جنکو

یادگار اُن کی جو دو شخص تھے فرخندہ خصال — اُن کو بھی کھا گئی موت اُٹھ گئے وہ بھی امسال
وہ اُٹھے کیا کہ ہوا خاتمۂ فضل و کمال — جانشیں اُن کا ملے کوئی یہ ہے خام خیال
ہائے اک ساتھ گئے شبلی و حالی دونوں
کر گئے میکدہ علم کو خالی دونوں

فلکِ علم کے شمس العلما تھے دونوں — ملکِ شہرت کے رئیس العرفا تھے دونوں
کیا زمانے کو بتائے کوئی کیا تھے دونوں — جن کا ثانی نہیں ایسے کملا تھے دونوں
یادگارِ سلف ایسے نظر آنے کے نہیں
جو ہیں، وہ نبض شناس اپنے زمانے کے نہیں

ان کی خدمات ہیں مثلِ مہِ تاباں روشن — کون واقف نہیں اس سے کہ وہ تھے کاملِ فن
کیا کلام اُن کے کمالوں میں کریں اہلِ سخن — پا چکا حسنِ قبول اُن کا ہر اک فعلِ حسن
کب وہ بیکار کوئی کام کیا کرتے تھے
رات دن خدمتِ اسلام کیا کرتے تھے

ابھی شبلی کا کفن بھی نہ ہوا تھا میلا — دام صیادِ اجل کا نئے سر سے پھیلا
لے چلا بھر کے وہ فتراک کا اپنے تھیلا — کر گئے حضرتِ حالی بھی قضا داویلا

چھپ گئے شمس و قمر بچھ گئیں ماتم کی صفوف
ہوگیا ڈیڑھ مہینہ میں کسوف اور خسوف

کوئی پوشیدہ و مخفی نہیں حالِ حالی — حال کے ساتھ ہی وابستہ مآلِ حالی
صورتِ بدر ہی رخشندہ کمالِ حالی — آج دنیا میں نہیں کوئی مثالِ حالی

دل ہی پژمردہ طبیعت میں بحالی نہ رہی
خاک تھی کہ یہاں صورتِ حالی نہ رہی



بیٹی کی محبت

(مرزا دبیر لکھنوی)

جب سراسیمہ وطن سے شہِ ابرار چلے — سرفروشی کو شہادت کے خریدار چلے
کہتی تھی فاطمہ صغرا کہ ہمیں باپ چلے — لو مسیحا بھی مجھے چھوڑ کے بیمار چلے

ساتھ اماں کے نہ ہمراہِ پدر جاتی ہوں
لوگو بتلاؤ تو میں کیوں نہیں مر جاتی ہوں

جب شہِ دیں کو دیا موت نے پیغامِ سفر — گریہ آغاز کیا سوچ کے انجامِ سفر
آگے صغرا کے کسی نے نہ لیا نامِ سفر — گھر میں ہنگامۂ محشر ہوا ہنگامِ سفر

شور تھا قبر میں محبوبِ خدا روتے ہیں
بیوطن آج حسینؑ ابنِ علیؑ ہوتے ہیں

منزلِ گور کا حضرت نے جو سامان کیا
گھر کو برباد کیا، شہر کو ویران کیا
بولی صغرا مجھے اس کوچ نے ہیجان کیا
میرے آزار پہ عیسیٰ نے نہ کچھ دھیان کیا

بے اجل آج موئی رنج کے مارے صغرا
چھٹکے بابا سے ہوئی گور کنارے صغرا

ہاتھ پکڑے ہوئے اکبر کا ہیں بابا تیار
بھیّا اصغر کو لیے ہوگئیں امّاں بھی سوار
یہ نہ جانا ہی مرے دم سے لگی اک بیمار
روکے مجرا تو لیا اور نہ کہا برخوردار

ٹھہرو اے صاحبو ٹھہرو، مجھے آ لینے دو
بھیّا اصغر کو کلیجے سے لگا لینے دو

ساربانوں سے کہو اونٹوں کو ٹھہراؤ ذرا
ناتوانی پہ مری رحم کرو بہرِ خدا
تم کو ہر چند ہی ملنے کی مرے کیا پروا
میری آواز سے بیزار ہو، صورت سے خفا

جلد اس طرح سے تشریف لیے جاتے ہو
آج گویا کہ مجھے دفن کیے جاتے ہو

مجھ سے بے آس ہو تم مجھکو شفا کا ہی یقیں
اور جو دم نکلے تو اب باپ کے آگے آمین
ورنہ ایسی بھی تو بیمار نہیں میں غمگیں
گرتی پڑتی ہوئی تم پاس میں آئی کہ نہیں

بھائی کے بیاہ کا میں کام کروں گی لوگو

دیکھکر سہرا میں اکبرؑ کا مرونگی لوگو

مجھکو الفت ہی تمھاری تمھیں الفت ہی نہیں ساتھ دوڑوں جو سواری کے سو طاقت ہی نہیں
امّاں لیں گود میں ایسی ہی قسمت ہی نہیں پیا آجائے پدر کو سو یہ صورت ہی نہیں

لونڈیاں ساتھ چلیں آج عزیزوں کی طرح
میں جو بیٹی تھی رہی گھر میں کنیزوں کی طرح

جس نے چلنے کو کہا سب سے کہا بسم اللہ مجھ سے جھوٹوں بھی نہ پوچھا میں گنہگار تھی آہ
گر خطا ہی یہ خطا ہی جو گنہ ہی یہ گناہ ان دنوں شدّتِ تپ سے مری حالت ہی تباہ

یہی نہ، دو دو پہر غش میں پڑی رہتی ہوں
اپنو ہشیار ہوں چلنے کے لیے کہتی ہوں

بیٹھے بیٹھے مرا اس وقت کا چلنا دیکھو گرنا بیساختہ، مشکل سے سنبھلنا دیکھو
تپ میں کیا دیکھا تھا اب دل کا اچھلنا دیکھو ہاتھ میں باندھتی ہوں ہاتھوں کا ملنا دیکھو

زردی آنکھوں کی تڑپ دل کی دھڑک سینے کی
سب یہ مرجانے کی باتیں ہیں ویا جینے کی

یک بیک میرے مقدّر کا بگڑنا دیکھو پاؤں پڑتی ہوں مرا پاؤں رگڑنا دیکھو
سانس کا بات کے کہنے میں اکھڑنا دیکھو حال یہ، اس پہ عزیزوں کا بچھڑنا دیکھو

غیر بھی ایسے عزیزوں کو نہ تنہا چھوڑیں
حیف ہی بیٹی کو اس وقت میں بابا چھوڑیں

یہ تو اس کو بھی سچ ہے اب ہو گیا صغرا کو یقیں
باپ کے ہاتھ کی مٹی مری قسمت میں نہیں
سب کو بابا نے مرے سامنے اسواریاں دیں
مجھکو تابوت ہی چھوٹا سا منگا دیں شہ دیں
بعد مرنے کے لب گور جو جائے صغرا
باپ کے ہاتھ کا تابوت تو پائے صغرا

آہ الزام سے خالی نہیں مرنا بھی مرا
بھیّا اکبر کا نہ بیاہ ایک برس تک ہوگا
پر مرا سوگ بھی کاہے کو کوئی رکھنے کا
لاڈلی کسکی ہوں اور کسکی ہوں پیاری میں بھلا
کیوں سب سمجھے نہ ہر ایک مجھ آزاری کو
طول سا طول کھنچا ہی مری بیماری کو

میں نے چاہا تھا کہ دکھلاؤں یہ حال زبوں
جاؤں در پر بھی نہ زحمت کے لیے میں مخزوں
پھر یہ سوچی کہ حقیر اور بھی کتنے میں ہوں
بات ہی جب نہ کوئی پوچھے تو کس سے روٹھوں
متوجہ جو کسی کو میں نہیں پاتی ہوں
آپ ہی روٹھتی ہوں آپ ہی من جاتی ہوں

ہائے اب میں ہوں یہ تنہائی ہی اور سونا گھر
نہ خبر مجھکو تمھاری نہ تمھیں میری خبر
دل کے بہلانے کو تم سب کے ہیں بھیّا اصغر
خالی جھولے سے میں ٹکراؤنگی یاں اپنا سر
الفتیں دیکھ کے ایک ایک کی میں سیر ہوئی
ہائے اللہ مری موت میں کیوں دیر ہوئی

شباب و شیب

(از حضرت بیخود بدایونی)

ہائے وہ صحنِ چمن وہ گلرخوں کے جمگھٹے
وہ جوانی جس کو کہتے ہیں دِوانی ہوشیار

وہ گلوں کے قہقہے وہ بلبلوں کے چہچہے
شبنم و گل کا وہ عالم وہ فضائے سبزہ زار

روئے جاناں کا وہ جلوہ چاندنی کا وہ سماں
زلفِ خوش خم کا وہ خم وہ چشمِ میگوں کا خمار

شوخ چشمک رہزنِ صبر و شکیب و ہوش و تاب
تیکھی چتون دشمنِ جان و دل و ضبط و قرار

وہ ادائے نازکی ناز آفرینی دم بدم
وہ نگاہِ شرم کا جھکنا حیا سے بار بار

وہ چھپانا روئے روشن کا ستانے کو مرے
وہ تسلّی کے لیے مجھ سے ہی ہو جانا دوچار

وہ نگاہِ شوخ جس سے فتنۂ محشر خجل
وہ خرامِ ناز جس سے خود قیامت شرمسار

وہ لبِ جو وہ لبِ پیمانہ وہ لب ہائے دوست
وہ ہجومِ اشتیاق و حسرتِ بوس و کنار

وہ گلے شکوے وہ پیمانِ وفا وہ چھیڑ چھاڑ
وہ مرے ملنے سے ہنس ہنس کر جتانا ننگ و عار

وہ طرب افزا نوائے مطرب و آہنگ نے
وہ نشاط انگیز دورِ ساغر و وصلِ نگار

وہ سہانی رات وہ خلوت کدہ وہ ولولے
وہ ترنگیں وہ امنگیں وہ سرورِ بے شمار

وہ ہم آغوشی کی لذت وہ شکر خوابِ وصال
تازگی بخشِ مشامِ جان و زلفِ مشکبار

وہ دمِ رخصت دلِ بیتاب کی بیتابیاں
جاتے جاتے وہ کسی کا شرم سے قول و قرار

اب کہاں وہ صحبتیں وہ لطفِ شب ہائے شباب
اب تو ہی چاروں طرف سے صبحِ پیری آشکار

اب کہاں وہ حسرتِ دیدار کا دل میں ہجوم
اب کہاں وہ رات دن جوشِ جنوں سر پہ سوار

اب کہاں وہ اعتبارِ ضبطِ آہ و جذبِ دل

اب کہاں وہ اعتمادِ نالۂ بے اختیار
اب کہاں الفت کے وہ نیرنگ جن کے دم سے تھی
آہِ سوزاں برق افگن چشمِ گریاں دجلہ بار
اب تو ہے فصلِ بہاراں میری آنکھوں میں خزاں
اب تو گلہائے چمن میری نگاہوں میں ہیں خار
خواب ہی بھولا ہوا سا اب تو لطفِ زندگی
بے مزہ سا اب تو افسانہ ہے ذکرِ وصلِ یار
اب تو فرقت میں مزہ ہے جو نہ لذّت وصل میں
اب تو وعدے کی تمنّا ہی نہ رنجِ انتظار
اب تو بس باقی ہے اتنا دل لگی کا مشغلہ
اب تو بس اس پر ہی اپنی زیست کا دارومدار
جستجوئے وقتِ رفتہ اور چشمِ خوں چکاں
ماتمِ عمرِ گذشتہ اور دستِ رعشہ دار



بادشاہ کے ہاتھی اور گھوڑے کی تعریف

(از حضرت ذوق دہلوی)

اُٹھ گیا مدرسۂ دہر سے یہ شرّ و شقاق
زید سے عمر کے دل میں نہیں باقی ہے نفاق

چرخ کے گنبدِ بے در میں رہیں گے محبوس
دم نہ ماریں گے مگر گونج کے شور و شلتاق

گر لکھوں وصف ترے اسپ جہاں گرد کا میں
دے فلک از پئے پامال قلم ہفت اوراق

تن میں اس طرح سے ہے اس کے پھڑکتی شوخی
قفسِ تن میں ہو جوں طائرِ جانِ عشّاق

ماہیِ زیرِ زمیں لوٹ کے ہو جائے کباب
جھاڑے گر سنگ پہ وہ نعل سے اپنے چقماق

وقت کو باندھ کے فتراک میں راکب اس کا
چرخ پر دائرے کھینچا کرے مانند نطاق

اُس فلک سیر کو گلگشت میں گر تو شاہا
جودتِ طبع کی جنبش کا چھوا دے مطراق

یوں اُڑے سوے فلک جیسے بہ تفریح مشام
بوے گل جائے تنفس میں دمِ استنشاق

کیا لکھوں وصف ترے فیلِ فلک پیکر کا
کہ گرانباری ہے اُس کی تنِ البرز پہ شاق

عمر بھر مطبخِ عالی میں رہا نعمت خواں
صفحۂ اطعمہ پر خامہ رہا جوں بسحٰق

ہیں ستاروں کی بھی آنکھیں انھی ہاتھوں کو لگیں
نورِ ہمّت کا زمانہ میں جو ہے عام انفاق

بہرِ دشمنِ بد کیش بہنگامِ وغا
گر فسوں ہووے جلوریز بہ دشتِ قبچاق

تو عجب کیا ہے کہ اُس کشورِ برفانی میں
شعلۂ تیغ شرربار ہو برقِ حرّاق

دل مرا ہو گیا اس وقت ہے وہ عالمِ نور
جس کی مشرق سے کریں نورِ معانی اشراق

کر دعا صدقِ ارادت سے کہ ہے وقتِ دعا
کیوں خموشی پہ کیا ذوقِ زباں کو مشتاق

دوشِ گردوں پہ ہوتا فرغلِ سنجابِ غمام

سبزہ تا خاک پہ ہو پیرہن استبراق
دختِ رز کو بہ سرِ محفلِ اہلِ تقوےٰ
جب تلک سینۂ مینا میں رہے دردِ فراق
تجھکو آفاق میں ہو دے رمضاں بھی مہِ عید
ہو ترے رویتِ دیدار پہ عیدِ آفاق
اور ترے نیرِ اقبال کے آگے دشمن
یوں رہے جیسے کہ ہو ماہ بایامِ محاق
صفحۂ دہر سے پھر گردشِ افلاک اسے
حرفِ باطل کی طرح دیوے جہاں سے ازہاق

رباعیات

(از مولانا حالی مرحوم)

نیکی اور بدی پاس پاس ہیں

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت
ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی خود اک بدی ہے گر ہو نہ خلوص
نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دور بہت



شراب اور جوانی

ہو بادہ کشی پہ نہ جوا نو مفتوں
خود عہدِ شباب اک جنوں ہی ابتم
گردن پہ نہ لو عقلِ خداداد کا خوں
کرتے ہو جنوں پہ اک اور جنوں

غرور سب عیبوں سے بدتر ہی

ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دور
عیب اپنے گھٹاؤ۔ ہر جبر دار رہو
پر عیب سے بچئے تا بمقدور ضرور
گھٹنے سے کہیں اُن کے نہ بڑھ جائے غرور

غرض

ہی نفس میں انساں کے جبلّی یہ مرض
جو خاص خدا کے لیے تھے کام کیے
ہر سعی پہ ہوتا ہے طلبگارِ عوض
دیکھا تو نہاں اُنمیں بھی تھی کوئی غرض

جسکو زندگانی کا بھروسا نہیں وہ کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا

دنیا کو ہمیشہ نقشِ فانی سمجھو
روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو

پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا — ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

آثارِ زوال

آبا کو زمین و ملک پر اطمینان — اولاد کو سستی پہ قناعت کا گمان
بچے آوارہ اور بے کار جوان — ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے مہمان

شانِ ادبار

صحرا میں جو پایا ایک چٹیل میدان — برسات میں سبزہ کا نہ تھا جس پہ نشان
مایوس تھے جس کے جوتنے سے دہقان — یاد آئی ہمیں قوم کے ادبار کی شان

مکر و ریا

حالیؔ رہِ راست جو کہ چلتے ہیں سدا — خطرہ انھیں گرگ کا نہ ڈر شیروں کا
لیکن اُن بھیڑیوں سے واجب ہے حذر — بھیڑوں کے لباس میں ہیں جو جلوہ نما

جوہرِ قابلیت

ہیں بے ہنروں میں قابلیت کے نشاں — پوشیدہ ہیں وحشیوں میں اکثر انساں
عاری ہیں لباسِ تربیت سے ورنہ — ہیں طوسی و رازی انھیں شکلوں میں نہاں

علم

اے علم کلیدِ گنجِ شادی تو ہے
سرچشمہ نعما و آبادی تو ہے
آسایشِ دوجہاں ہی سایہ میں ترے
دنیا کا وسیلہ دیں کا ہادی تو ہے

عزّت کس چیز میں ہے

دولت نے کہا مجھسے ہی عزّت ہی یہاں
فرمایا ہنر نے میں ہوں عزّت کا نشاں
عزّت بولی۔ غلط ہی دونوں کا بیاں
میں بھید ہوں حق کا جو ہی نیکی میں نہاں

عفو با وجودِ قدرتِ انتقام

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ ای بارِ خدا
مقبول ترا کون ہی بندوں میں سوا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے
جو لے سکے۔ اور نہ لے بدی کا بدلا

تنزّل اہلِ اسلام

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہی ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

چند عیب بہت سی خوبیوں کو نہیں مٹا سکتے

موجود ہنر ہوں ذات میں جسکی ہزار — با ظن نہو عیب اُسمیں اگر ہوں دوچار
طاؤس کے پائے زشت پر کر کے نظر — کر حُسن وجمال کا نہ اُس کے انکار

بڑھاپے میں موت کے لیے تیار رہنا چاہیے

کی طاعتِ نفس میں بہت عمر بسر — انجام کی رکھّی نہ جوانی میں خبر
کیفیتِ شب اُٹھا چکے۔ اب جالی — مجلس کرو برخاست۔ ہوا وقتِ سحر

دولت میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے

ڈر ہی کہ پڑے نہ ہاتھ دل سے دھونا — زردار ذرا سوچ سمجھکر ہونا
جس طرح کہ سونے کی کسوٹی ہی محک — ہی جوہر انساں کی کسوٹی سونا

کھانا بغیر بھوک کے مزا نہیں دیتا

کھانے تو بہت میسر آئے ہیں ہمیں — جو بھوک میں چکھے۔ دل سے بھائے ہیں ہمیں
پر سب سے لذیذ تھے وہ کھانے ای بھوک — جو تونے کبھی کبھی کھلائے ہیں ہمیں



قانون بداخلاق سے مانع نہیں ہوتے

قانون ہیں بیشتر یقیناً بیکار
جو نیک ہیں اُن کو نہیں حاجت انکی
حاشا کہ ہو ان پہ نظم عالم کا مدار
اور بد نہیں بنتے نیک اِن سے زنہار

انسان اپنے عیب اپنے سے بھی چھپاتا ہے

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں
اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے
اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں
بس مجھکو بھی معلوم ہی جیسا ہوں میں

رباعیات وقطعات اکبر

کیا تم سے کہیں جہان کو کیا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن
غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا

رشوت ہی گلوے نیک نامی کا چھُرا
ہر چند کہ نلے محل خوشامد ہی بُری
عیّاشی ہر بدی کے پہئے کا دُھرا
گستاخ مگر خوشامدی سے بھی بُرا



آزاد سے دین کا گرفتار اچھا
ہر چند کہ زور بھی ہے اک خصلتِ بد
شرمندہ ہو دل میں وہ گنہگار اچھا
واللہ کہ بے حیا سے مکّار اچھا

بے سود ہے گنج و مال و دولت کی تلاش
اکبرؔ تو سرورِ طبع کو علم میں ڈھونڈھ
ذلت ہے در اصل جاہ و شوکت کی تلاش
محنت میں کر سکون و راحت کی تلاش

بے غیرت و خود فروش و جاہل سے نہ مل
یک جا کر دیں حوادثِ دہر اگر
حق سے جو ہو غافل ایسے غافل سے نہ مل
جائز ہے کہ اُن سے مل مگر دل سے نہ مل

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زر ہے بیکار
بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں

خاطر مضبوط دل توانا رکھو
ہو جائیں گی مشکلیں تمھاری آسان
امید اچھی خیال اچھا رکھو
اکبرؔ اللہ پر بھروسا رکھو

کہتا ہوں میں ہندو و مسلماں سے یہی
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ
اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

روزی مل جائے مال و دولت نہ سہی گھر بار میں خوش رہیں عزیزوں کے ساتھ	راحت ہو نصیب شان و شوکت نہ سہی دربار میں باہمی رقابت نہ سہی
ہنگامۂ شکر و شکوہ دنیا میں ہے گرم کھلتا نہیں رازِ دہر شکوہ ہے تو یہ	لیکن مرے دل سے یہ صدا آتی ہے اور شکر یہ ہے کہ موت آجاتی ہے
دولت وہ ہے جو عقل و محنت سے ملے ایمان کا ہو نور دلمیں وہ راحت ہے	لذّت وہ ہے کہ جوشِ صحت سے ملے عزت وہ ہے جو اپنی ملت سے ملے
سنئے حکمت جو میری گفتار میں ہے پروانے نے شمع سے لپٹنا چاہا	اک حدِّ ادب ہر ایک سرکار میں ہے پہلے تھا نور میں اور اب نار میں ہے
شیطان سے دلکو ربط ہو جاتا ہے حد سے جو سوا ہو حرص یا خود بینی	دشوار انسان کو ضبط ہو جاتا ہے اکثر یہی کہ خبط ہو جاتا ہے
جس کو خدا سے شرم ہے وہ ہے بزرگِ دیں جسکو کسی کی شرم نہیں اُس کو کیا کہوں	دنیا کی جس کو شرم ہے مردِ شریف ہے فطرت میں وہ رذیل ہے دل کا کثیف ہے

خلقت جو کہیں ذلیل ہو جاتی ہے
گو جسم میں ظاہرا توانائی ہو
بے غیرت و بے ذلیل ہو جاتی ہے
اخلاق میں وہ علیل ہو جاتی ہے

دنیا کو بہت ذلیل پایا میں نے
اخلاقی پہلوؤں سے جانچا اکبر
بے غیرت و بے ذلیل پایا میں نے
شدّت سے اُسے علیل پایا میں نے

افسوس سفید ہو گئے بال ترے
تو زلفِ بتاں بنا ہوا ہے اب تک
لیکن ہیں سیاہ اب بھی اعمال ترے
دنیا پہ ہنوز پڑتے ہیں جال ترے

مذہب، قانون و قوم کا بانی ہے
توہین ایک دوسرے کی کرتے ہیں جو لوگ
خالص طاعت، عروجِ روحانی ہے
یہ جہل ہے یا ہوائے نفسانی ہے

انساں چاہے جو بات اچھی چاہے
شیطان سے وہ فلاسفی ہے منسوب
بدیوں سے محترز ہو نیکی چاہے
جس کا مطلب ہے کر وہ جو جی چاہے

اللہ کا حق اگر تلف ہوتا ہے
اس کے لیے کون سر بکف ہوتا ہے

دنیا طلبی میں ہے یہ ہنگامہ وشور
حاصل پھر اس سے کیا شرف ہوتا ہے

انسان جو عمر ختم کر چکتا ہے
فانی دنیا کا دیکھ لیتا ہے رنگ
خوش ہو چکتا ہے آہ بھر چکتا ہے
زندہ جو رہا بھی وہ تو مر چکتا ہے

رکتا نہیں انقلاب چارا کیا ہے
تسکین کے لیے مگر ہے کافی یہ خیال
حیراں ہیں ملک، بشر بچارا کیا ہے
جو کچھ ہے خدا کا! ہمارا کیا ہے

مسکیں گدا ہو یا ہو شاہِ ذی جاہ
آہی جاتا ہے زندگی میں اک وقت
بیماری و موت سے کہاں کس کو پناہ
کرنا پڑتا ہے سب کو اللہ اللہ

تسبیح و دعا میں جس نے لذت پائی
کوئی نہیں خوش نصیب اس سے بڑھکر
اور ذکر خدا سے دل نے راحت پائی
بس دونوں جہاں کی اس نے نعمت پائی

ہو علم اگر نصیب تعلیم بھی کر
اللہ عطا کرے جو عظمت تجھ کو
دولت جو ملے اس کو تو تقسیم بھی کر
جو اہل ہیں اس کے انکی تعظیم بھی کر

کہنے سننے کی گرم بازاری ہے
ایسا سنیئے کہ کہنے والا ابھرے

مشکل ہی مگر اثر پڑا سے دل میں
ایسا کہیئے کہ بیٹھ جائے دل میں

جب لطف و کرم سے پیش آئے محبوب
جب مثلِ نسیم وہ گلے سے لگ جائے

اگلے رنجوں کو بھول جانا اچھا
مانند کلی کے پھول جانا اچھا

اعمال کے حسن سے سنورنا سیکھو
مرنے سے مفر نہیں ہی جب ای اکبر

اللہ سے نیک امید کرنا سیکھو
بہتر ہی یہی خوشی سے مرنا سیکھو

اس عہد میں یہی ہی بس داخلِ نکوئی
شوقِ عمل نہیں ہی فکرِ اجل نہیں ہی

مذہب پہ نکتہ چینی ملت کی عیب جوئی
ناصح بنے ہیں اکثر عابد نہیں ہی کوئی

غنچہ رہتا ہے دل گرفتہ پہلے
کھلتی ہی نسیم آکے رازِ فطرت

رنگِ چمن فنا سے گھبراتا ہے
سنتے ہی پیامِ دوست کھل جاتا ہی

انسان یا بہت سے دلوں کو ملا سکے
ہم تو اسی کو علم سمجھتے ہیں کام کا

یا کوئی شے مفید خلائق بنا سکے
پڑھنے کو مستعد ہیں جو کوئی پڑھا سکے

ایک آرزو



دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بُجھ گیا ہو
شورش سے ہوں گریزاں دل ڈھونڈھتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
لذّت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
گُل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھکو جہاں نما ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندّی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بنکر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دُلہن کو
سرخی لیے سُنہری ہر پھول کی قبا ہو
راتوں کے چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
امّید اُن کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو
پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی مؤذن
میں اس کا ہم نوا ہوں وہ میری ہم نوا ہو
کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجھکو سحر نما ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو نالہ مری دعا ہو
دل کھول کر بہاؤں اپنے وطن پہ آنسو
سرسبز جن کی نم سے بوٹا امید کا ہو
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو
ہر دردمند دل کو رونا میرا رُلا وے

بیہوش جو پڑے ہیں شاید اُنھیں جگا دے

رباعیات

(از حضرت بیخود بدایونی)

ناداں ہی اگر دعوئ دانائی ہے
اور عقل پہ پھولا ہی تو سودائی ہی
سر جس نے اُٹھایا ہی یہاں مثلِ حباب
فوراً ہی اُبھرنے کی سزا پائی ہی

بے مہروں سے امید عنایت کیسی
ہر دم غمِ ہجراں کی حکایت کیسی
جب حاصلِ عشق جان کھونا ٹھہرا
او خانہ خراب پھر شکایت کیسی

کہتے ہو کہ عادت بھی بدل جاتی ہی
کہتے ہو کہ حسرت بھی نکل جاتی ہی
کہنے ہی پر آگئے تو یہ بھی کہدو
بگڑی ہوئی قسمت بھی سنبھل جاتی ہی

قطروں کو دُرِ خوش آب ہوتے دیکھا
ذرّوں کو بھی آفتاب ہوتے دیکھا
لیکن صد حیف حالِ زارِ بیخود
اسمیں بھی نہ انقلاب ہوتے دیکھا



گذری ہوئی الفت کی یاد

(از نواب مصطفےٰ خانصاحب شیفتہ مرحوم)

روز غم میں کیا قیامت ہی شب عشرت کی یاد
اشک خوں سے آگئیں رنگینیاں صحبت کی یاد

میری حالت دیکھ تو تغیر کتنی ہو چکی
وصل کے دن دمبدم کیوں شیشہ ساعت کی یاد

میں ہوں بیکس اور بیکس پر ترحم ہے ضرور
حسن روزافزوں دلا دینا مری حالت کی یاد

طاقت جنبش نہیں اس حال پر قصد عدم
مرگئے پر بھی رہے گی اپنی اس ہمت کی یاد

غالباً ایام حرماں بیخودی میں کٹ گئے
آتی ہی پھر آرزو بھولی ہوئی لذت کی یاد

دل لگانے کا ارادہ پھر ہی شاید شیفتہ
ایسی حسرت سے جو ہی گذری ہوئی الفت کی یاد

غزل

(از حضرت شیفتہ)

اصحاب درد کو ہی عجب تیزیٔ خیال
مثلِ زبان نطق قلم کی زبانِ حال

عہدِ وفا کیا ہے نباہیں گے! اشک عبث
وعدہ کیا ہے آئیں گے! بیجا ہے احتمال

کیا کچھ وہاں سے منزلِ مقصود پاس ہے
یا ایہا الذین سکنتم علی الجبال

ناز و غرور ٹھیک ہی جور و جفا درست
کس کو ہوا نصیب یہ حسن اور یہ جمال

ساقی پلا دہ بادہ کہ غفلت ہو آگہی
مطرب سنا وہ نغمہ کہ ہو جس سے قال حال

ہم اگلے عشق والوں کی تقلید کیوں کریں
اے خوردہ گیر نحن رجال وہم رجال

اہلِ طریق کی بھی روش سب سے ہی الگ
جتنا زیادہ شغل، زیادہ فراغ بال

ہنگامِ عہد کام میں لائے وہ ایسے لفظ
جن کو معانی متعدد پہ اشتمال

یہ بات تو غلط ہے کہ دیوان شیفتہ ق ہے نسخۂ معارف و مجموعۂ کمال
لیکن مبالغہ تو ہے البتہ اس میں کم ہاں ذکر خد و خال اگر ہے تو خال خال

سراپا

(از مولوی جمال الدین حسن بدایونی)

نسبت ان آنکھوں سے بادام کو دوں کیا مقدور ہیں وہ انگور بنے جس سے مئے ناب طہور
عشق ان آنکھوں کا ہے نرگسِ شہلا کو ضرور دیدۂ چشم کبوتر بھی ہوا چکنا چور

کہدو آئینہ ذرا آنکھ چھپا کر دیکھے
نور کا عکس نہ دیکھا ہو تو آکر دیکھے

راست بینی سے مری چشم کا رتبہ ہے بلند وصف بینی جو ہے درپیش تو دل ہے خرسند
یہ وہ بینی ہے خدا بیں جسے کرتے ہیں پسند قصرِ پرنور سموات پہ پھینکوں میں کمند

نور سے بھی ہے کہیں رتبۂ عالی اسمیں
دست قدرت نے عجب نوک نکالی اسمیں

مژدہ ای بلبل سرگشتۂ بستانِ جمال ہو مبارک تجھے گلگشت گلستانِ جمال

آئے ایّام بہارِ چمنستانِ جمال
یہ دکھاتے ہیں تجھے اب گلِ خنداں جمال

لالۂ گلشنِ جاوید دکھائیں تجھکو
گل دکھائیں گلِ خورشید دکھائیں تجھکو

ہر جگر عارضِ عالی گلِ بستانِ قدم
غیرتِ خاطرِ گلہائے فرادیس ودارم

گلِ رعنائیِ خیابانِ گلستانِ ہمم
بوئے گل راحتِ ارواح وقلوبِ عالم

فرشِ دیدار تھا جو اس گلِ محمودی کا
سرد گلزار کیا آتشِ نمرودی کا

پیاری باتیں

(از حضرت محسن کاکوروی)

اک نظر بھر کی مجھپر ساقی
ہاں تشنہ لبوں پر ہو جا
کشتی مے نہ چلی میرے بغیر
کردے سرشار مجھے جی بھر کے
گردشِ جام شراب اے ساقی
غرق کرتا ہے تلاطم مجھکو
یہ بھی اک وقت ہی بیڈھب ساقی

ماہرو آئینہ پیکر ساقی
دل کی لہروں کا سمندر ہو جا
میرے دریا ترے بیڑے کی خیر
دے صراحی پہ صراحی بھر کے
دم آنے دم آب اے ساقی
آج اللہ کوئی خم مجھکو
یار کرتا ہے مخاطب ساقی

چھینٹے دے دے کے رُلاتا ہی مجھے
عنبر بن بن کے بناتا ہے مجھے
ہیں یہ کیا رنگ تمھارے محسن
سُست کیوں ہو مرے پیارے محسن

نہ وہ صورت نہ وہ سیرت تیری
یار کیا ہو گئی حالت تیری
اُڑ گیا رنگ ترا بُو ہو کر
بہ گیا خونِ دل آنسو ہو کر

حیف حالت تری دکھ پائی ہوئی
ہائے صورت تری مُرجھائی ہوئی
لب پہ آئے ہوئے نالے پیہم
ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں ہر دم

چہرہ ڈوبا ہوا حیرانی میں
عرق آیا ہوا پیشانی میں
زردی چھائی ہوئی رخساروں پر
سرسوں پھولی ہوئی انگاروں پر

مردنی چھائی ہے چہرہ دیکھو
اپنی جاتی ہوئی دنیا دیکھو
چھپ گیا چاند ستارا ہو کر
اُڑ گیا آئنہ پارا ہو کر

ہر دم اک رنگ بدلتا ہی کیوں
شمع کی طرح سے جلتا ہی کیوں
یہ اگر کھے ترے گُل کاری کے
جن کی کلیوں میں چُبھے ہیں کانٹے

کامدانی کا پہنا چھوڑا
لُٹ گیا تیرا شہانا جوڑا
رنگ اُڑ اُڑ کے بکھر جانے لگا
ناتوانی کو بھی غش آنے لگا

بند آنکھیں کیے روتے دیکھا
رات ہم نے تجھے سوتے دیکھا
کس بلا کا تو ہوا ہے مجنوں
لیلیٰ کہتی ہے بلائیں لے لوں
کوہ پر جا کے اگر سر مارے
کوہکن ہی تجھے پتھر مارے

باتیں کرتے ہو تو رک جاتے ہو
آپ ہی چھیڑ کے شرماتے ہو

کبھی ملتے ہو تو بیگانے سے
کبھی ہنستے ہو تو دیوانے سے

شہر کا سیر و تماشا چھوڑا
چاندنی چوک کا رستا چھوڑا

رکھ دیے موسمِ گل میں کیونکر
طاقِ نسیاں پہ سنہرے ساغر

آشنا گل کے نہ سوسن کے رہے
باغ میں تم تو خزاں بن کے رہے

بیٹھے جنگل میں نہ یکسو ہو کر
کالے کوسوں پھرے آہو ہو کر

نجد میں تیرا گلا ہوتا ہے
قیس پہلے سے خفا ہوتا ہے

کسی بت نے تجھے حیران کیا
کسی کافر نے مسلمان کیا

بیٹھے بٹھلائے یہ سودا تجھکو
کیا ہوا میرے کنہیا تجھکو

دیکھ بھر آئیں تری پھر آنکھیں
یاد آئیں کوئی کافر آنکھیں

خون میں ڈوبی نگاہیں کیسی
ہیں مری جان یہ آہیں کیسی

بگڑی کیوں اے مرے بسمل چتون
یاد آئی کوئی قاتل چتون

عشقِ گیسو نے یہ عقدہ کھولا
سر پہ چڑھ کر ترے جادو بولا

جال پھیلائے ہیں منتر والے
بال کھولے ہوئے گھونگر والے

جان لیتے ہیں نکھرنے والے
تم سلامت رہو مرنے والے

دل لگا ہے تو پشیمانی کیوں
جان کی فکر مری جانی کیوں

آبرو کی نہ تجھے پروا کب تک
ننگ و ناموس کا کھٹکا کب تک

ہوش میں آؤ سمجھ والے ہو
تم تو بے مئے پیئے متوالے ہو

تلو کہیں ایک نہ مانی آخر
مٹ گئی تیری جوانی آخر

چاندنی پچھلے پہر کی کب تک
روشنی شمع سحر کی کب تک

دلِ ناشاد کو رکھ قابو میں
نہ سہی یار نہ ہو پہلو میں

جھوٹی کھاؤ نہ ہزاروں قسمیں
پھینکدو دل جو نہیں ہے بس میں

حال دشمن کا دگرگوں ہوجائے
کیوں ترا دل مری جان خوں ہوجائے

تھام لے دل نہ تجھے دلبر کی قسم
سر اُٹھا تجھکو مرے سر کی قسم

دوستانہ نجھے سمجھاتے ہیں
نہیں سنتا ہی تو ہم جاتے ہیں

بس نجھے آتے ہیں چکّر ساقی
لے مرے ہاتھ سے ساغر ساقی

اپنا نجھے غش آتا ہے
دل کہیں اور لیے جاتا ہے

تیری محفل کا یہی طور رہے
دور جب تک ہے یہی دور رہے

طب یونانی اور انگریزی کا ملاپ

(از شمس العلما ڈاکٹر نذیر احمد صاحب)

گل ہوا ہی چاہتا ہے طب یوناں کا چراغ
اور یہ جو کچھ دیکھتے ہو آخری ہے اشتعال

یہ عمارت کہنگی سے گل کے آٹا ہو گئی
اب نہ جالینوس کے باوا سے ہو اسکی سنبھال

علمِ یونانی و انگریزی کہ دو بہنیں ہیں یہ
بے محابا مدتوں سے لڑ رہی تھیں بدخصال

گرچہ یونانی بڑی تھی پر نہ تھا اُس کے تئیں
اپنی چھوٹی بہن کی پرداخت کا مطلق خیال

کوستی تھی اور کہتی تھی کہ تو ہو جائے رانڈ
ٹکڑے روٹی کے لیے کرتی پھرے گھر گھر سوال

چھوٹی کھوٹی طرح سے بول اُٹھی کہ بس بک بک نہ کر
تیری ست جائیں چھنٹیے اور تیری مر جائیں لال

جب دونوں میں ہوئی تُھکّا فضیحت اسقدر
اُٹھ گیا دونوں طرف سے پاس حدِّ اعتدال

بارے دونوں کو کسی ڈھب سے گلے ملوا دیا
ورنہ ہوتی خاندانِ طب کی رسوائی کمال

دور ہو کر رنجشیں پھر ہو گیا گہرا ملاپ
اب تو سننے میں نہیں آتی کبھی جنگ و جدال

اب تلک ایک ہی جگہ میں دونوں گھر آباد ہیں
نے حسد ہے نے گلہ نے شکوہ نے رنج و ملال

